ماہنامہ
جہد حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق

HRCP

Monthly JUHD-E-HAQ - February-2019 - Registered No. CPL-13

جلد نمبر 26.....شمارہ نمبر 2.....فروری 2019

''پولیس مقابلوں'' کا سلسلہ کب رُکے گا؟

سالانہ عمومی اجلاس (اے جی ایم) 2019

نوٹس

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کا سالانہ عمومی اجلاس 07 اپریل، 2019 کو کمیشن کے مرکزی دفتر 107 ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوگا۔ تمام اراکین جن کے واجبات ادا ہو چکے ہیں، اجلاس میں شرکت کر سکتے ہیں۔

وہ اراکین جو ضمنی قوانین میں ترامیم چاہتے ہیں انہیں اپنی تجاویز اس نوٹس کی وصولی کے بعد جتنی جلدی ممکن ہو سکے سیکرٹریٹ بھیجنا ہوں گی تاکہ جنرل باڈی کو بروقت مطلع کیا جا سکے۔

اراکین عمومی اجلاس میں اپنے خرچ پر آئیں گے۔ دفتر باہر سے آنے والے اراکین کو رہائش فراہم کرے گا بشرطیکہ وہ سیکرٹریٹ (مسٹر محمد الیاس) کو 23 مارچ 2019 تک رہائش کی قسم اور قیام کی مدت سے آگاہ کر دیں۔

سالانہ عمومی اجلاس کا ایجنڈا مندرجہ ذیل ہے

اے جی ایم ایجنڈا 2019

07 اپریل 2019

09:00 - 08:30	رجسٹریشن/ ریفریشمنٹ
09:15 - 09:00	ایجنڈے اور پچھلی اے جی ایم کی کارروائی کی منظوری
09:45 - 09:15	سٹیرنگ کمیٹی کی رپورٹ 2018
10:45 - 09:45	صوبائی دفاتر کی مختصر رپورٹس
	☆ بلوچستان (بشمول تربت ٹاسک فورس)
	☆ خیبر پختونخوا
	☆ پنجاب (بشمول ملتان دفتر)
	☆ سندھ (کراچی اور حیدرآباد دفاتر)
	☆ گلگت اور اسلام آباد کے دفاتر
11:15 - 10:45	خزانچی کی رپورٹ، آڈیٹرز کی تعیناتی
12:00 - 11:15	ضمنی قوانین میں ترامیم اگر ہونا ہوں
13:30 - 12:00	عمومی بحث/اراکین اور کارکنوں کی تجاویز/اے جی ایم کی پریس ریلیز کے لیے نکات
14:30 - 13:30	دوپہر کا کھانا
17:00 - 14:30	سیمینار
17:30 - 17:00	اے جی ایم کی پریس ریلیز

ڈاکٹر مہدی حسن

(چیئرپرسن)

ماورائے عدالت ہلاکتوں کا ظالمانہ رجحان ناقابلِ قبول ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کہا ہے کہ یہ ایک حالیہ واقعے پر دہشت زدہ ہے جس میں پنجاب پولیس کی ایک خصوصی فورس نے مبینہ طور پر انسداد دہشت گردی کے ایک آپریشن میں چار افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ آج جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسے ابتدائی طور پر "دہشت گردوں کے ساتھ مقابلہ" قرار دیا گیا تھا وہ ایک غیر ضروری اور پر تشدد کارروائی تھی جس میں ایک نوعمر لڑکی اور اس کے والدین جاں بحق ہوئے۔

'یہ واقعہ کئی پہلوؤں سے انتہائی تشویش کا باعث ہے۔ پہلا یہ کہ اس میں معین قانونی طریقہ کار کا کوئی نام ونشان دکھائی نہیں دیتا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ دہشت گرد تنظیموں کی جانب سے ہونے والے تشدد کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ تاہم، 'مقابلوں میں ہونے والی ہلاکتوں' کے واقعات جو حقائق کے منظر عام پر آنے اور ان کی تصدیق ہونے کے بعد 'ماورائے عدالت ہلاکتوں' کے واقعات کے طور پر سامنے آتے ہیں، انہیں قانون کی حکمرانی برقرار رکھنے کے لیے ایک 'ناگزیر برائی' قرار دیتے ہوئے جائز ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا یہ کہ ابتداء میں اس واقعے کو 'ناگزیر نقصان' قرار دیتے ہوئے رد کیا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بطور ریاست اور معاشرہ سزا سے استثنا کے حوالے سے ہماری برداشت کس حد تک بڑھ چکی ہے۔ تیسرا یہ کہ واقعے سے متعلق بیانات کو جس طرح بار بار تبدیل کیا گیا اور ان میں جو تضادات سامنے آئے وہ ایک ایسے ناقص نظام کی جانب اشارہ کرتے ہیں جس میں ریاست کے مختلف شعبوں کے درمیان بہت کم ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس میں فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔

'ایچ آر سی پی اپنے اس موقف کو پھر سے دہراتا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی اصلاح اور تربیت پر وسیع طور پر اور عقلمندی سے وسائل صرف کیے جائیں۔ اس سے 'مقابلوں' میں ہونے والی ہلاکتوں کے واقعات کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔ اسی طرح، قانون نافذ کرنے والے تمام اداروں کے علاوہ عوام، میڈیا اور لوگوں کے منتخب نمائندوں کو ریاست کی آئینی ذمہ داری کے حوالے سے حساس بنایا جائے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ کسی بھی شخص کو اس کی 'زندگی یا آزادی سے محروم نہ کیا جائے، ماسوائے اس کے کہ قانون اس کی اجازت دیتا ہو۔ اس کا ایک اہم پہلو اس بات کو سمجھنا ہے کہ اس بنیادی حق کی دوسری شق کو بہانہ بنا کر اس میں 'مقابلوں' میں ہونے والی ہلاکتوں کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس ظالمانہ رجحان کے خاتمے کے لیے اعلیٰ سطح پر ماورائے عدالت ہلاکتوں کے مجرموں کو قانون کے تحت سزا دی جائے اور انہیں تحفظ فراہم نہ کیا جائے۔

'ایچ آر سی پی سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے داخلی امور کی جانب سے واقعے کی عدالتی تحقیقات کے مطالبے کا خیر مقدم کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ یہ تحقیقات شفاف طریقے سے کی جائی گی اور اس کی سفارشات کو عام کیا جائے گا۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 21 جنوری 2019]

فہرست

پریس ریلیزیں	03
پولیس کے ہاتھوں معصوم شہریوں کے قتل کی اندوہناک داستان	05
ایذا رسانی پر توجہ	08
حقوق کی تحریکیں اور ریاستی طرز عمل	09
تعلیم	10
بچوں کے حقوق کا مختصر تعارف	11
عورتیں	13
سندھ کے لیے انسانی حقوق پر مبنی ثقافتی منصوبہ	
لسانی اور مذہبی اقلیتیں	15
اقلیتوں کا طویل انتظار	17
معذوری کا شکار افراد کے حقوق	18
قومی کمیشن برائے اقلیتی حقوق کا مسودہ قانون	19
اقلیتیں اور خوف کی زندگی	20
ایڈیٹر کے نام خطوط	22

بلوچستان سے اٹھائے جانے والوں کی گنتی کون کر رہا ہے؟

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے فوجی عدالتوں کی مدت، جو کہ اس برس جنوری میں ختم ہونے والی تھی، بڑھانے کے لیے بل لانے کے حکومتی فیصلے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ آج جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے برملا کہا ہے کہ 'فوجی عدالتوں کا ادارہ کسی بھی جمہوری نظام، جو کہ اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق اور آزادیوں کی بالا دستی کا دعویٰ کرتا ہے، کے بالکل منافی ہے۔

'ریاست کا فریضہ ہے کہ قانون کی حکمرانی کو اس طرح قائم کرے کہ جس سے شہریوں کے باضابطہ قانونی کاروائی اور شفاف سماعت کے حقوق متاثر نہ ہوں۔ اسی طرح، شہریوں کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے بھی قانون کی حکمرانی قائم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ یہ ایک دوسرے سے کٹی ہوئی ذمہ داریاں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ، اس بات کے شواہد بھی نہیں ہیں کہ فوجی عدالتیں قانون کی حکمرانی میں اضافہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

'فوری انصاف' کا تصور جنگجو انتہا پسندی جو کہ ابتدا میں فوجی عدالتوں کے قیام کا سبب بنی تھی، کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا متبادل نہیں ہوسکتا نہ ہی یہ ملکی عدلیہ اور پولیس کے نظام جو کہ سویلین حکام کے تحت سویلین امن و امان کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے، کی تربیت اور وسائل کے لیے درکار وقت کا نعم البدل ہوسکتا ہے۔'

'فوجی عدالتوں کے خلاف بات کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے ان خوفناک حالات کی اہمیت کو نظر انداز کیا جارہا ہے جن میں یہ عدالتیں متعارف ہوئی تھیں، تاہم 2014 میں آرمی پبلک سکول میں قتل عام کے بعد سے دہشت گردی کے واقعات میں کمی آئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوجی عدالتوں کو کام جاری رکھنے کی اجازت دینے کا کوئی جواز موجود نہیں۔ ایچ آر سی پی کو فوجی عدالتوں کی کاروائی میں پائی جانے والی راز داری، ان عدالتوں میں سزاوں کی بہت زیادہ شرح اور اس شرح کو پانے کے لیے استعمال ہونے والے ذرائع سے بھی تکلیف ہے۔ یہ تمام باتیں انصاف کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ پشاور ہائی کورٹ کا حالیہ فیصلہ، جس نے فوجی عدالتوں سے سزا پانے والے 70 سے زا?ئد افراد کی سزا مسنوخ کی ہے، ان تحفظات کی نشاندہی کرتا ہے۔'

'اگر حکومت فوجی عدالتوں کی مدت بڑھانے میں کامیاب ہوگئی تو اس سے فوجداری نظام انصاف میں بہتری لانے کی کوششیں۔۔۔ اقدامات جو بہت زیادہ ضروری ہیں، خاص طور پر نچلی عدالتوں میں، شدید متاثر ہوسکتی ہیں۔ فوجی عدالتوں کی میعاد میں توسیع عالمی میثاق برائے شہری و سیاسی حقوق، جس کا پاکستان فریق ہے، کے بھی منافی ہے۔ انصاف کو آؤٹ سورس کرنا مسئلے کا پائیدار حل نہیں ہے۔'

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 12 جنوری 2019]

نئے جی بی آرڈر کا نفاذ مئوخر کیا جائے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے صدر مملکت سے مطالبہ کیا ہے کہ گلگت بلتستان کے عوام کے ساتھ ضروری مشاورتوں تک حکومت جی بی آرڈر 2018 کا نفاذ ملتوی کیا جائے۔

صدر ڈاکٹر علوی کو بھیجے گئے اپنے خط میں ایچ آر سی پی نے کہا ہے کہ:

" حکومت گلگت بلتستان آرڈر 2018 کو آپ کی منظوری کے لیے سپریم کورٹ کی طے شدہ مدت کو مدنظر رکھتے ہوئے، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ گلگت بلتستان کیعوام کے جذبات کو مناسب اہمیت دیں اور متعلقہ لوگوں کے ساتھ ضروری مشاورتوں تک اس متنازعہ آرڈر کا نفاذ مئوخر کریں۔

"ایچ آر سی پی نے اس سے پہلے نشاندہی کی تھی کہ گلگت بلتستان آرڈر 2018 گلگت بلتستان (خودمختاری و سیلف گورننس) آرڈر 2009 کی نسبت ز?ادہ رجعتی تھا۔ گلگت بلتستان کے جمہوریت پسند لوگ اپنے بنیادی حقوق کو تسلیم کرانے اور پاکستان کے شہری کی حیثیت سے مساوری سلوک کے لیے طویل عرصے سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انہیں اپنے حقوق کے لیے احتجاج جاری رکھنے پر مجبور کرنا سیاسی لحاظ سے غیر دانشمندانہ فیصلہ ہوگا۔"

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 23 جنوری 2019]

جہد حق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں/ کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ/اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہد حق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جاسکے۔

جہد حق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے نیچے دی گئی ویب سائٹ پر موجود ہیں

www.hrcp-web.org

پولیس کے ہاتھوں معصوم شہریوں کے قتل کی اندوہناک داستان

19 جنوری 2019 کو ایلیٹ پنجاب پولیس نے ایک ہی خاندان کے تین افراد اور ڈرائیور کو ہلاک کر دیا جسے ابتداء میں انہوں نے خفیہ معلومات پر بنیاد پر ہونے والا آپریشن قرار دیا جس سے پورے ملک میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ٹی وی سکرین پر خبریں چلنے لگیں اور واقعہ کی ویڈیوز ساتھ ہی ساتھ زندہ بچ جانے والے ایک بچے جو کہ واقعہ کا عینی شاہد تھا کی ویڈیو سوشل میڈیا پر پھیل گئی۔

لاہور کے علاقے کوٹ لکھ پت کے رہائشی خلیل، ان کی بیوی نبیلہ اور تیرہ سالہ بیٹی اریبہ اور ان کی فیملی کے قریبی دوست ذیشان کو نیشنل ہائی وے میں اوکاڑہ ٹول پلازہ کے قریب گاڑی پر گولیاں مار کے ہلاک کر دیا گیا جب وہ اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کرنے بورے والا جا رہے تھے۔ تین کم سن بچے (ایک لڑکا اور دو بیٹیاں) جو کہ گاڑی میں موجود تھے زندہ بچ گئے۔

حکومتی اہلکاروں نے پہل پہل یہ مؤقف اپنایا کہ گاڑی میں سوار لوگ اغوا کار تھے جو کہ بچوں کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے اور ان پر گولی چلائی گئی۔ انہوں نے گولیاں چلانے کے عمل کو قانون نافذ کرنے والوں کی جرأت اور بہادری قرار دیا کہ جس سے اغوا ہونے والے بچوں کی بازیابی ممکن ہوئی۔ بعدازاں، محکمہ انسداد دہشت گردی (C.T.D) کے اہلکاروں نے کہا کہ مقتولین دہشت گرد تھے اور ان کا تعلق شدت پسند تنظیم داعش سے تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ دہشت گرد خاندانوں کو انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور پولیس ناکوں سے بچنے کے لیے خواتین اور بچوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ اس مؤقف کو بھی جلد تبدیل کیا گیا اور وضاحت کی گئی کہ جب گاڑی سے فائرنگ ہوئی تو مجبوراً جوابی کارروائی میں فائرنگ کی گئی۔ ایک اور موڑ کہانی میں تب آیا جب CTD کے اہلکاروں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ گاڑی میں سے بارودی مواد اور اسلحہ برآمد کیا گیا ہے۔ حالانکہ خلیل کے بیٹے نے ویڈیو میں اس اندوہناک واقعہ کی جو کہانی سنائی وہ CTD کے تمام وضاحتوں کی نفی کرتی ہے۔

مختلف اوقات میں مختلف مؤقف اپنانے کی وجہ سے محکمہ انسداد دہشت گردی CTD کی طرف سے دی جانے والی وضاحتیں مشکوک ظاہر ہوتی ہیں۔ حقائق تک پہنچنے کے لیے سول سوسائٹی کی ایک مشترکہ فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے 22 جنوری 2019 کو ساہیوال کا دورہ کیا اور اسی ٹیم نے 3 جنوری 2019 کو لاہور میں مقتولین کے اہل خانہ سے ملاقات کی اور اہل علاقہ کے انٹرویوز کیے۔

فیکٹ فائنڈنگ ٹیم میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اور دستک چیری ٹیبل ٹرسٹ کے نمائندوں کے علاوہ انسانی حقوق کے معروف کارکن سروپ اعجاز ایڈووکیٹ اور ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ پاکستان (سیپ۔پاکستان) کے نمائندے تھے۔

ٹیم نے فیکٹ فائنڈنگ مشن کی شروعات 22 جنوری 2019 کو جائے وقوعہ سے شروع کی جو کہ ساہیوال شہر کے قریب ہے۔ سب انسپکٹر اور اے ایس آئی سمیت دیگر یوسف والا پولیس اسٹیشن کے سٹاف ممبران نے وقوعے یا آپریشن میں کسی بھی طرح کی شمولیت اور ملوث ہونے سے انکار کیا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ حادثہ پیش آنے والے دن کی صبح دو پولیس کی گاڑیاں جائے وقوعہ کے آس پاس نظر آئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں کسی قسم کی تنبیہہ نہیں کی گئی تھی۔ یہ ایک معمول کا کام تھا اور CTD یا دیگر وفاقی یا صوبائی حکام ضرورت پڑنے پر ایسے آپریشن کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں آپریشن کی منصوبہ بندی کے حوالے سے کوئی خبر نہیں تھی جب تک کہ راہگیروں نے انہیں اطلاع نہیں دی کہ یوسف والا پولیس اسٹیشن کے 15 کلومیٹر کے فاصلے پر یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ اُنہوں نے صاف الفاظ میں کہا کہ یہ آپریشن سی ٹی ڈی نے دیگر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ساتھ مل کر کیا ہے اور انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ CTD کی ایک ٹیم لاہور سے ہی گاڑی کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی مگر راستے میں ان کا رابطہ منقطع ہو گیا اور انہوں نے ساہیوال CTD کو اطلاع دی کہ جوں ہی گاڑی ساہیوال کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے اُس کا تعاقب کیا جائے۔ فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے جائے وقوعہ پر گاڑی کی کھڑکی کے ٹوٹے شیشے پائے جب کہ باقی شواہد پہلے ہی پولیس نے اکٹھے کر کے اپنی تحویل میں لیے تھے۔ کسی شیشے پر کسی قسم کا کوئی داغ نہیں تھا۔ مقامی پولیس حادثہ ہونے کے آدھے گھنٹے بعد موقع پر پہنچی تب تک CTD نے لاشیں اور بچوں کو موقع واردات سے دور کر دیا تھا۔ صرف وہ بدقسمت گاڑی وہی پر موجود تھی۔ پولیس کو 45SMG اور 6MM کے خالی خول زمین پہ پڑے ملے۔ عینی شاہدین کے مطابق کئی خول محلے کے بچوں نے اٹھا لیے تھے۔ ٹیم کو بتایا گیا کہ 22 جنوری 2019 کے دن 2 ایف آئی آر رجسٹر ہوئی ہیں۔ پہلی ایف آئی آر لاہور سی ٹی ڈی کے پاس رجسٹر کرائی گئی (کیس نمبر 2)

19 جنوری 2019 کے دن جب واقعہ پیش آیا جبکہ دوسری ایف آئی آر یوسف والا پولیس اسٹیشن ساہیوال میں 20 جنوری 2019 کو درج کرائی گئی۔ (کیس نمبر 33) یوسف والا ایف آر کی کاپی ٹیم نے حاصل کی۔

عینی شاہدین کے بیانات

4 عینی شاہدین جن کا ٹیم نے انٹرویو کیا جنہوں نے (سی ٹی ڈی) کے بیانیے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ گاڑی کے اندر سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوئی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ مبینہ حملے کے بعد گاڑی سے کوئی اسلحہ برآمد نہیں ہوا۔ انہوں نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ گاڑی میں سے کوئی فائرنگ نہیں ہوئی نہ ہی ذیشان اور گاڑی میں سوار کسی شخص نے کوئی مزاحمت کی۔ سی ٹی ڈی کے اہلکاروں نے گاڑی کو ٹکر مار کر اُسے زبردستی رکوایا۔ ایلیٹ فورس کے اہلکاروں نے پیچھے سے فائرنگ کر کے گاڑی کے دائیں جانب کے ٹائر پنکچر کیے۔ ایلیٹ فورس کے اہلکاروں نے پیچھے سے فائرنگ کر کے گاڑی کے دائیں جانب کے ٹائر پنکچر کیے۔ گاڑی سڑک کے بیچ میں نصب دھاتی جنگلے سے ٹکرانے کے بعد کنٹرول سے باہر ہو گئی۔ ایلیٹ فورس کے اہلکاروں نے پیچھے سے کئی گولیاں ماریں۔ ایلیٹ فورس کے اہلکار اپنی گاڑی سے باہر نکلے، خلیل سے گفتگو کی، کار کے شیشوں سے بچوں کو باہر نکالا اور پھر تین اطراف سے گولیاں مارنا شروع کر دیں۔ اُنہوں نے کار پر بہت قریب سے فائرنگ کی اور کار سے کسی قسم کی جوابی فائرنگ نہیں ہوئی۔ پھر وہ گولیوں سے چھلنی نعشوں کو کار میں چھوڑ کر تین بچوں کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ پھر انہوں نے بچوں کو قریبی جھاڑیوں (جائے واردات سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر دور) میں چھوڑ دیا۔ مقامی لوگوں نے بچوں کو ایک نزدیکی پٹرول پمپ پر منتقل کیا۔ سی ٹی ڈی اہلکار واپس آئے، بدبخت کار سے لاشیں لیں اور تین زخمی بچوں کو کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا۔ اسی دوران کار کے اردگرد لوگ اکٹھے ہو گئے، اپنے موبائل فون سے ویڈیوز بنائیں اور انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کیں۔ عینی شاہدین نے بتایا کہ کار کو اندر سے چیک کرنے کے دوران اُنہیں کار میں ہتھیاروں، آتشی اسلحے یا دہشت گردی سے متعلقہ مواد کے کوئی شواہد نہیں ملے۔

مشترکہ تحقیقاتی ٹیم سے ملاقات

ٹیم نے واقعے کی تحقیقات کے لیے صوبائی حکومت کی تشکیل کردہ مشترکہ تحقیقاتی ٹیم (جے آئی ٹی) کے سربراہ سے بھی ملاقات کی۔ جے آئی ٹی کے سربراہ، ایڈیشنل آئی جی پولیس سید اعجاز شاہ نے یہ کہتے ہوئے تحقیقات پر پیش رفت سے متعلق معلومات فراہم نہ کیں کہ ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ ٹیم کو 30 دنوں کے اندر رپورٹ جمع کروانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ آئی ایس آئی، آئی بی، ایم آئی اور پولیس مل کر واقعے کی تحقیقات کر رہی ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو دیگر ایجنسیوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

یوسف والا پولیس اسٹیشن

ٹیم نے یوسف والا پولیس اسٹیشن کا دورہ کیا جہاں اطلاعات کے مطابق، گاڑی کھڑی تھی۔ ٹیم نے ایف آئی آر کی نقل لی، اُس کا تفصیلی معائنہ کیا اور کار کی تصویریں لیں مگر پولیس ٹیم کو کار سے برآمد ہونے والا کسی قسم کا مواد نہ دکھا سکی۔ گاڑی کے تمام شیشے اور ونڈ سکرین سفید تھی اور اُن پر کسی قسم کی قلعی نہیں تھی جو کہ ذرائع ابلاغ میں رپورٹ ہوا یا اس کا متعلقہ پولیس نے دعویٰ کیا تھا۔ ٹیم نے کار میں چھت سمیت مختلف اطراف سے مختلف سائز کی 36 گولیوں کے سوراخوں کا مشاہدہ کیا۔ ٹیم کے مشاہدے میں یہ بھی آیا کہ خاندان کی کچھ چیزیں ابھی بھی کار میں پڑی ہوئی تھیں۔ ایس ایچ او نے وہی داستان دہرائی کہ واقعہ ہونے تک مقامی پولیس اُس کے بارے میں لاعلم تھی۔

ڈی سی دفتر، ساہیوال

ڈپٹی کمشنر زمان وٹو اور ڈی پی او محمد علی ضیاء نے بتایا کہ ساہیوال انتظامیہ آپریشن / مقابلے کے بارے میں لاعلم تھی۔ ڈی پی او نے کہا کہ سی ٹی ڈی اپنی کارروائیوں سے قبل مقامی پولیس کو اُن کے بارے میں آگاہ کرنے کی پابند نہیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ ماضی قریب میں سی ٹی ڈی نے اس علاقے میں کارروائیاں کی ہیں اور یہ کوئی خلاف معمول بات نہیں۔ اِن سڑکوں پر پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہونا یا اُن کا گشت معمول کا کام ہے۔ وہ آزادانہ سرگرمیاں کرتے ہیں کیونکہ سی ٹی ڈی کے پاس اوور لیپ کرنے کا اختیار ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ گولی چلانے کا حکم کس نے دیا تھا، اُنہوں نے کہا کہ سی ٹی ڈی کی قیادت موجود حالات کے مطابق حکم دے سکتی ہے۔ مقامی پولیس کا کام کارروائی کے بعد امن عامہ کی صورت حال کو کنٹرول کرنے تک محدود ہے۔ ڈپٹی کمشنر کا کہنا تھا ''ہم نے سول ہسپتال کو سیکیورٹی فراہم کی اور عوام کو کنٹرول کیا جو جی ٹی روڈ پر احتجاج کے لیے اکٹھا ہوئی تھی''۔ اُن کا کہنا تھا ''سی ٹی ڈی بعض اوقات انہیں اعتماد میں لیتی ہے، بعض اوقات نہیں لیتی۔ اس بار ہم مکمل طور پر لاعلم تھے''۔

سی ٹی ڈی دفتر، ساہیوال

سی ٹی ڈی کے ساہیوال دفتر نے فیکٹ فائنڈنگ ٹیم سے ملنے سے انکار کر دیا۔ فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے دفتر میں کئی پیغامات بھیجے اور اُن کے عملے سے بھی بات کی جو فیکٹ فائنڈنگ مشن سے یہ پوچھنے کے لیے اپنے دفتر سے باہر آیا کہ مشن نے اُن کے دفتر کا دورہ کس مقصد کے لیے کیا ہے۔ مشن کے ایک رہنما نے عملے کے ایک رکن کے ذریعے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجا اور درخواست کی کہ دفتر میں دستیاب کسی بھی ذمہ دار اہلکار سے اُن کی ملاقات کروائی جائے، مگر اُنہیں بتایا گیا کہ کوئی بھی ذمہ دار اہلکار ملاقات کے لیے دستیاب نہیں ہے۔

مرنے والوں کے رشتہ دار

فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے اگلے دن (23 جنوری) خلیل اور ذیشان کے گھروں کا دورہ کیا۔ خلیل کے بھائی جمیل نے بتایا کہ اُن کے خاندان کے کئی لوگ مختلف گاڑیوں میں لاہور سے بورے والا کے نزدیک اپنے آبائی گاؤں میں شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ کسی دوسری گاڑی میں تھے اور مرنے والوں کے ساتھ اُن کا رابطہ ٹوٹ گیا کیونکہ اُن کے موبائل بند ہو گئے تھے۔ خلیل کے والد نے بتایا کہ وہ اُس وقت اُن کے ساتھ رابطے میں تھے جب وہ اوکاڑہ بائی پاس عبور کر رہے تھے اور اوکاڑہ ٹول پلازہ کی طرف رواں دواں تھے۔ اُس کے بعد خلیل کے ساتھ اُن کا رابطہ ختم ہو گیا کیونکہ اُنہوں نے اُسے فون کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر اُس کا موبائل فون بند جا رہا تھا جس کے بعد اُنہوں نے ریسکیو سروس 15 سے رابطہ کیا مگر اُن کے پاس کوئی معلومات نہیں تھیں حالانکہ انٹرنیٹ اور ٹی وی پر خبریں گردش کر رہی تھیں جن میں بچوں کو یہ کہہ کر پیش کیا جا رہا تھا کہ ساہیوال ٹول پلازہ کے قریب پولیس مقابلہ ہوا ہے جس میں بچوں کی جان بچ گئی ہے۔ اُن کا بڑا بھائی جلیل ڈسٹرکٹ ہسپتال ساہیوال دوپہر کے تقریباً 2 بجے پہنچا مگر اُسے مرنے والوں کی لاشیں وصول کرنے میں چھ گھنٹے لگے۔ وہ ایک چھوٹے سے تاریک کمرے میں موجود بچوں سے ملا جو بالکل اکیلے تھے۔ ہسپتال کی سکیورٹی نے اُسے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کرنے سے روکنے کی کوشش کی مگر جلیل وزیر اعلیٰ تک کسی طرح پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جو جلیل کے مطابق وہاں میڈیا کو ریچ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سی ایم نے اُن کے ساتھ تعزیت کا اظہار نہیں کیا تھا اور اُس کی بجائے خلیل کے اہل خانہ کو دو کروڑ (20 ملین) روپے کے معاوضے کا اعلان کر دیا۔ جلیل نے معاوضہ لینے سے انکار کیا اور اپنے خاندان کو انصاف دینے کا مطالبہ کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ سی ایم کو مقدمے کے فوری اندراج اور اہل خانہ کو لاشوں کی حوالگی یا کم از کم اُنہیں لاشیں دکھانے کا حکم دینا چاہیے تھا۔ اُن کا الزام تھا کہ پوسٹ مارٹم اُن کی اجازت کے بغیر کیا گیا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ایف آئی آر کسی جگہ پہلے ہی درج ہو چکی تھی۔ خاندان ایف آئی آر درج کروانے گیا تھا۔ ڈی پی او ساہیوال نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور اُنہیں لاہور میں کراس ایف آئی آر درج کروانے کا مشورہ دیا۔ اُنہوں نے مقامی لوگوں کی مدد سے قومی شاہراہ کو دونوں اطراف سے بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر جا کر واقعے کے 17 گھنٹوں کے بعد ایف آئی آر درج ہوئی۔ اُنہوں نے بتایا کہ مختلف محکموں سے آنے والی متضاد خبروں نے آپریشن کو مشکوک بنا دیا ہے۔

خلیل کے بھائی جمیل نے بتایا کہ حملے میں زندہ بچنے والے بچوں کو ریاست نے مکمل طور پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ ذرائع ابلاغ کے دعوؤں کے برعکس، کسی حکومتی شعبے نے اب تک اُن سے رابطہ نہیں کیا۔ چھوٹی بچی جس کا ہاتھ ٹوٹا ہوا شیشہ لگنے سے زخمی ہو گیا تھا، کو 23 جنوری 2019 کو جنرل ہسپتال لے جایا گیا جہاں ہسپتال کے عملے نے اُس کی مرہم پٹی بدلنے سے انکار کر دیا تھا، کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری تنظیم نے اب تک بچوں کی مشاورت یا صدمے کے علاج کے لیے اُن سے رابطہ نہیں کیا۔ خلیل کے باپ، ماموں اور بھائی نے بتایا کہ وہ تقریباً 30 برسوں سے ذیشان اور اس کے اہل خانہ کو جانتے ہیں۔ ذیشان اُن کے خاندان کے فرد کی طرح تھا۔ اُسے بھی خلیل کے خاندان کے ساتھ شادی کی تقریب میں شریک ہونا تھا۔

اہل علاقہ کی آراء بھی لی گئیں۔ قرب و جوار میں جن لوگوں سے بھی بات ہوئی اُن سب کا یہی خیال تھا کہ وہ عام مہذب لوگ ہیں اور کوئی بھی مشکوک یا خلاف معمول سرگرمی اُن کے مشاہدے میں نہیں آئی۔

ٹیم نے ذیشان کے گھر کا دورہ کیا اور اُس کے بھائی اور بہنوئی سے ملی جنہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ ذیشان کسی بھی قسم کی سیاسی یا مذہبی سرگرمی میں ملوث نہیں تھا۔ اُس کے بھائی جو ڈولفن فورس میں کام کرتے ہیں، نے بتایا کہ آج سے تقریباً دو برس قبل اُن کے سارے خاندان کی سکیورٹی کلیرنس کی گئی تھی مگر اُس سے اس حوالے سے کبھی کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر ذیشان کی کار مشکوک تھی تو پھر اُنہوں نے آج تک گاڑی کو روکا کیوں نہیں حالانکہ گاڑی مئی 2009 سے جب سے خریدی گئی تھی گلی میں کھڑی ہوئی تھی۔

ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، سی ٹی ڈی کے اہلکاروں کی فائرنگ کے نتیجے میں ذیشان کو 10 گولیاں، 13 سالہ اریبہ کو چھ گولیاں، اس کی ماں نبیلہ بی بی کو چار گولیاں اور باپ محمد خلیل کو 13 گولیاں لگی تھیں۔ عمیر نامی بچے کی دائیں ٹانگ میں گولی لگی جبکہ منیبہ کا ہاتھ گاڑی کا شیشہ ٹوٹنے سے زخمی ہوا تھا۔

ڈی ایچ کیو ہسپتال ساہیوال

ڈی ایچ کیو ہسپتال ساہیوال آنے پر ٹیم کو چشم دید بیان ملا کہ بچوں کو ہسپتال میں کب اور کیسے لایا گیا تھا۔ ہسپتال عملے کے ایک رکن نے بتایا کہ ایلیٹ فورس کی وردی میں ملبوس چار نقاب پوش کمانڈوز نے 19 جنوری کو رات کے تقریباً 12:30 بجے زندہ بچ جانے والے تین بچوں کو ہسپتال کی ایمرجنسی میں چھوڑا تھا۔ اُنہوں نے بچوں کو اکیلا چھوڑا اور جاتے ہوئے ہسپتال کے عملے کو بتایا کہ ان بچوں کو اغوا کاروں کی گرفت سے ایک پولیس مقابلے میں بازیاب کروایا گیا ہے۔ واقعے میں زخمی ہونے والے سب سے بڑے بچے عمیر خلیل کی دائیں ٹانگ کے اوپر

والے حصے میں گولی لگنے کا زخم تھا جبکہ زندہ بچنے والی دولڑکیوں میں سے ایک منیبہ کا ہاتھ ٹوٹا ہوا شیشہ لگنے سے زخمی تھا۔ تینوں بچے پریشان اور صدمے کی حالت میں لگ رہے تھے۔ زخمی ہونے کے باوجود، دونوں کمسن لڑکیاں خاموش تھیں۔ دوپہر کے تقریباً 12 بجے، سپیشل برانچ کے دو اہلکار آئے۔ اُنہوں نے کہا کہ واقعہ دہشت گردی وقومی سلامتی کا معاملہ ہے اور کسی کو بھی بچوں سے ملنے یا اُن کی ویڈیوز بنانے کی اجازت نہ دی۔ سہ پہر 3:10 پر دونوں اہلکار ہسپتال سے چلے گئے مگر بچوں کے خاندان میں کوئی بھی ابھی تک ہسپتال نہیں پہنچا تھا۔ خلیل کے رشتہ دار تقریباً سہ پہر کے 4:30 بجے ہسپتال پہنچے تھے۔ بچوں کو رات کے تقریباً 11 بجے لاہور جنرل ہسپتال منتقل کیا گیا، وزیراعلیٰ کے دورے کے بعد جنہوں نے ہدایت کی تھی کہ بچوں کو کسی بہتر ہسپتال منتقل کیا جائے۔

ہسپتال میں موجود کسی بھی فرد نے واقعے میں مارے جانے والوں کی لاشوں کی حوالگی کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کیں۔

ایک آدمی کے انٹرویو، جس نے واقعے کے روز لاشوں کی حوالگی کے لیے احتجاجی مظاہرے کی قیادت کی تھی، سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقوعے کے تقریباً چھ گھنٹوں بعد سکیورٹی ایجنسیوں نے لاشیں ہسپتال میں ورثا کے حوالے کی تھیں۔

مشاہدات اور حقائق

(ii) فیکٹ فائنڈنگ ٹیم کو مسافروں کی بدبخت کار سے مزاحمت یا جوابی کارروائی کے کسی قسم کے شواہد نہیں ملے۔ عینی شاہدین کے انٹرویوز، کار کی چیکنگ، اور ہسپتال کے عملے سے ہونے والی بات چیت سے ملنے والے حقائق سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ کار میں موجود لوگوں (بشمول ذیشان، خلیل یا کسی دوسرے فرد) نے فائرنگ کی ہو۔ لہٰذا، ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ بغیر کسی انتباہ کے پولیس کی فائرنگ مکمل طور پر غیر ضروری تھی۔ انٹیلی جنس کی ناکامی کی عکاس تھی اور آپریشن کرنے والی پولیس ٹیم کی مجرمانہ غلطی تھی۔ فیکٹ فائنڈنگ ٹیم کو خلیل اور اس کے اہل خانہ کے کسی انتہا پسندانہ سرگرمی میں ملوث ہونے یا کسی بھی دہشت گرد نیٹ ورک سے منسلک ہونے کے متعلق کسی قسم کی شہادت یا رائے نہیں ملی۔ خاندانوں اور اس کے اہل خانہ کی لی گئی آراء میں خلیل کی بے گناہی کی تائید کی گئی ہے۔ ذیشان کے بارے میں بھی اس سے ملتی جلتی آراء تھیں۔ چونکہ اس رپورٹ کو لکھنے تک سی ٹی ڈی کا کوئی سرکاری مؤقف نہیں ملا تھا، ٹیم ذیشان کے ملوث ہونے کی ٹھوس شہادت فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ ٹیم کسی بھی انتہا پسند نیٹ ورک کے ساتھ ذیشان کی مبینہ وابستگی کے متعلق حتمی رائے کا کام سرکاری جے آئی ٹی کی تحقیقات پر چھوڑتی ہے۔

(iii) یہ بات بھی ٹیم کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کڑی نگرانی کا پورا نظام آپریشن والے دن یہ جاننے میں ناکام کیسے رہا کہ بدقسمت کار کے مسافر درحقیقت کمسن بچے اور معصوم عورتیں تھیں۔ ہمارے خیال میں، اگر آپریشن کرنے والی ٹیم کو اس حقیقت کا پہلے سے پتہ ہوتا تو دردناک نتائج سے بچا جا سکتا تھا۔ اس صورت حال سے سی ٹی ڈی کی کارروائیوں اور انہیں بنیاد فراہم کرنے والے نظاموں کے مکمل جائزے کی ضرورت اجاگر ہوئی ہے۔ معصوم جانوں کے ضیاع کا سبب بننے والے اس خون آلودہ آپریشن کی انجام دہی اور اس کا سبب بننے والی معلومات میں بعض سنگین خرابیاں بھی ٹیم کے مشاہدے میں آئی ہیں۔

(iv) ٹیم کو یہ جان کر بھی حیرانی ہوئی کہ ایسی کارروائیاں اُس ضلع کی پولیس کو لاعلم رکھ کر جاتی ہیں جہاں یہ کارروائیاں ہوتی ہیں۔ ٹیم کو یقین تھا کہ اگر باقاعدہ معین طریقہ کار کی پاسداری کی جائے تو اِس کے بدقسمت واقعات سے بچا جا سکتا ہے۔

(v) واقعے سے پہلے اور بعد میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں بھی ٹیم کے مشاہدے میں آئیں۔ جس طریقے سے سی ٹی ڈی پولیس نے کارروائی کی۔ فائرنگ کے بعد بچوں کے ساتھ بُرے طریقے سے پیش آنا، ورثا کو کافی دیر تک لاشوں تک رسائی کا نہ ملنا، ساہیوال میں ایف آئی آر کے اندراج سے انکار اور اس رپورٹ کے اجرا تک عدم تعاون، یہ سب کچھ واقعے میں ملوث حکام اور سرکاری اہلکاروں کی بے حسی کی عکاسی کرتا ہے۔

(vi) ٹیم کو اس بات پر بھی تحفظ تھا کہ حکام نے کسی قسم کے پیشگی اقدامات نہیں کیے تھے۔ اگر ذیشان پر کسی دہشت گرد نیٹ ورک کا حصہ ہونے کا شبہ تھا اور اس چیز کا متعلقہ حکام کو پتہ تھا، تو پھر دیگر راستے بھی اختیار کیے جا سکتے تھے اور اس وقوعے سے بچا جا سکتا تھا۔ یہ آپریشن قومی شاہراہ پر ایک پُرہجوم مقام پر دن کی روشنی میں کر کے کئی راہگیروں کو خوفزدہ کیا گیا اور بالآخر پوری عوام کو جس نے بہیمانہ واقعے کی تصویریں دیکھیں۔

(vii) ٹیم کو ایسے حقائق یا معلومات نہیں ملیں جن سے مبینہ ہدف کو ختم کرنے کے لیے حد سے زیادہ طاقت کے استعمال اور ناگزیر نقصان کو جواز فراہم ہوتا ہو۔

(viii) ٹیم کے مشاہدے میں آیا کہ آپریشن کے بعد کی کارروائی من مانی، غیر محتاط اور فوجداری تحقیقات کے بنیادی اصولوں کے منافی تھی۔

(a) جائے وقوعہ کو محفوظ کرنے اور شواہد کو غیر مجاز ہاتھوں میں جانے سے روکنے کے لیے کسی قسم کے اقدامات نہیں کیے گئے تھے۔

(b) آپریشن میں مارے جانے والوں کی نعشوں اور اُن کی گاڑی کو مسلح مقابلے کے بعد کافی وقت تک یونہی چھوڑ دیا گیا اور اس وقت وہاں کوئی اہلکار نہیں تھا۔

(c) وقوعے کے وقت زیر استعمال گاڑی جو کہ دعوے کے مطابق دہشت گردوں کے ساتھ بنیادی رابطہ تھا، یوسف والا پولیس اسٹیشن میں کھلے آسمان تلے کھڑی تھی، غیر محفوظ حالت میں اور چھیڑ چھاڑ اور خرابی کا شکار ہو سکتی تھی۔

(ix) خلیل کے خاندان سے لی گئی معلومات سے پتہ چلا کہ ریاست نے زندہ بچ جانے والے بچوں کی ذہنی اور جسمانی بہبود کے لیے کوئی بھی ٹھوس اقدامات نہیں کیے۔ واقعے کے گواہان اور متاثرین ہونے کی حیثیت سے بچوں کی نہ تو بحرانی اور صدماتی کیفیت سے متعلق مشاورت کی گئی اور نہ ہی اُنہیں میڈیا کی غیر ضروری تحقیقات اور بے جا عوامی سوالات سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدامات کیے گئے۔

ماحصل اور سفارشات

ماورائے عدالت قتل کا یہ واقعہ پولیس کے ہاتھوں بغیر کسی ٹھوس جواز کے عام پاکستانیوں کے بہیمانہ قتل کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

یہ کیس سیکیورٹی فورسز سے متعلق ایک بڑے مسئلے کی علامت ہے جو حالیہ وقوعے جیسے واقعات پر کام کرتے وقت ٹھوس تحقیقات اور رابطہ سازی کے نظاموں کے بارے میں مناسب علم اور تجربے سے عاری ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود، علم میں کمی عام شہریوں کی زندگی کو غارت کرنے کا جواز نہیں ہو سکتی اور انتہائی قابل مذمت ہے۔ اس حوالے سے، محکمہ انسداد دہشت گردی کے سٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجرز اور انٹیلی جنس مانیٹرنگ سے لے کر انسداد دہشت گردی کی عملی کارروائیوں تک کے عمل کا احاطہ کرنے والے نظاموں پر کڑی نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ ایسے نظاموں کی پارلیمانی نگرانی کا پرزور مطالبہ مستقبل میں ایسے واقعات کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

ریاست پاکستان یہ امر یقینی بنانے کی پابند ہے کہ اس کے تمام شہریوں کے حقوق ہر قسم کے حالات میں محفوظ رہیں۔ پولیس فورسز سمیت ریاستی اداروں پر بھی یہ فریضہ عائد ہے۔ انسانی زندگی و ناموس کی اس حد تک تضحیک جس کا مظاہرہ اس واقعے میں پولیس نے کیا ہے، ناقابل قبول ہے اور مجرموں کو سخت سزا دی جانی چاہیے تاکہ اس طرح کا واقعہ پھر کبھی پیش نہ آئے۔

ریاست کو اس واقعے میں شامل بچوں کی جسمانی و ذہنی بہبود کے لیے بھی مناسب انتظامات کو یقینی بنانا ہوگا۔

ایذارسانی پرتوجہ

آئی۔اے۔رحمان

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں برسرپیکارممالک میں اذیت کے بڑھتے ہوئے رجحان نے 'ایذارسانی مخالف عالمی تنظیم (اوایم سی ٹی) اذیت ودہشت گردی، پرایک نیاورکنگ گروپ بنانے پرمائل کیا ہے۔ اس مہینے کے اوائل میں تیونس میں اپنے افتتاحی اجلاس میں گروپ نے جوسوچ بچارکیاوہ پاکستان سے بہت زیادہ تعلق رکھتا ہے۔

کانفرنس کاسُراوایم سی ٹی کے نائب صدرمختارطریفی نے باندھا، جب انہوں نے کہا کہ ایذارسانی کے خلاف کام کرنے والے کارکنان ہرروزدیکھتے ہیں کہ کس طرح پرتشددانتہاپسندی کے خلاف جائزجنگ کو ایذارسانی کوجوازبخشنے کے لیے استعمال کیا گیا۔''اگرچہ کوئی بھی قانون سے بالاترنہیں، انہوں نے کہا، کوئی بھی قانون کی دہلیزسے نیچے بھی نہیں ہے چاہے اس پہ کسی بھی جرم کاالزام کیوں نہ ہو۔''

گروپ کے اراکین جوافریقہ، ایشیا، یورپ اورلاطینی امریکہ میں 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کی اگلی صفوں میں لڑرہے ہیں، کی شکایت تھی کہ انہیں اپنے ملکوں میں ایذارسانی کی بڑھتی ہوئی عوامی قبولیت کا مسئلہ درپیش ہے۔ خلیج کے خطے سے آنیوالے مندوب نے گروپ کے خیالات کی ترجمانی کی جب انہوں نے کہا: "سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ انسانی حقوق کے محافظین کونشانہ بنانے کے لیے ریاستیں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ناجائزاستعمال کررہی ہیں، انہی لوگوں کے خلاف جن کی ہمیں متشدد انتہاپسندوں کے خلاف جنگ میں مدددرکارہے'۔امید کی جاسکتی ہے کہ اسلام آبادگروپ کی سفارشات کابغورجائزہ لے گا۔

اس حقیقت سے انکارممکن نہیں کہ پاکستان میں اذیت عام ہے۔اذیت سے تحفظ کی آئینی ضمانت شہادت کے حصول کے لیے اذیت کی ممانعت تک محدود ہے، حالانکہ اس کی پاسداری بھی نہیں کی جاتی۔فوجداری جرم میں موردالزام لوگوں کواس وقت تک اذیت دی جاتی ہے جب تک وہ 'اعتراف' نہیں کرلیتے یہاں تک کہ ان جرائم کا بھی جوانہوں نے نہیں کیے ہوتے۔ پولیس کوتحقیقات/تفتیش کے غیرمتشدد ذرائع بارے بالکل بھی علم نہیں۔ پاکستان پر نہ صرف فوجداری بلکہ دیوانی مقدمات میں ملوث لوگوں کے خلاف ظالمانہ، غیرانسانی اورتضحیک آمیزسلوک اورسزا کی اجازت دینے پربھی تنقید کی جاتی ہے۔تحقیقات کے دوران اذیت اورجیل میں جرائم پربطورسزا اذیت کے علاوہ، جبری گمشدگیاں بھی شدیداذیت کی مثالیں ہیں جس کا نشانہ نہ صرف متاثرین کو بلکہ ان کے خاندانوں کوبھی بنایا جاتا ہے۔قومی احتساب بیوروکا ایف آئی آر کے اندراج سے قبل لوگوں کوگرفتارکرنا اورمہینوں تک انہیں حراست میں رکھنا اذیت دینے کے زمرے میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ مشتبہ شخص کے وقارکومجروح نہ کرنے کی سپریم کورٹ کی ہدایت کابھی نیب پرکوئی خاص اثرنہیں پڑا۔

گذشتہ چند برسوں کے دوران کمسن گھریلو ملازماؤں کوخوفناک اذیت کا نشانہ بنائے جانے کے کئی واقعات رپورٹ ہوئے مگراس کے باوجودگھریلوتشدد کے خاتمے کے لیے کوئی مئوثر قانون نہیں بن سکا۔ایک بارسینٹ کی قائمہ کمیٹی کے بعض اراکین نے سکول کے بچوں کودی جانے والی جسمانی سزاکوپاکستان کی ثقافت کا حصہ قراردیا تھا۔

خصوصی حراستی مراکز، محفوظ مقامات اورنجی جگہوں پرجوکہ محکمہ جیل خانہ جات کے کنٹرول میں نہیں ہیں، مشتبہ افرادکی طویل حراست خاص طورپرلمحہ فکریہ ہے۔اس حوالے سے، پاکستان سے اذیت کے خلاف میثاق کے اختیاری پروٹوکول کی توثیق کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔ پروٹوکول کا مقصدایسے مقامات پرملکی وعالمی اداروں کے مستقل دوروں کانظام وضع کرنا تھاجہاں لوگوں کوحراست میں رکھا جاتا ہے۔

> ایک مکمل طورپرآزادادارہ ایذارسانی یابرے سلوک کے تمام الزامات کی فوری، مکمل اورغیرجانبدارانہ تحقیقات کرے، اس جرم میں ملوث لوگوں کے خلاف باقاعدہ مقدمے چلائے جائیں اوراگروہ قصوروارپائے جائیں تو انہیں ان کے جرائم کی نوعیت کے مطابق سزائیں سنائی جائیں۔

پاکستان نے اذیت کے خلاف میثاق کی 2009 میں توثیق کی اور میثاق پرعملدرآمد سے متعلق ملک کی پہلی رپورٹ اذیت کے خلاف یواین کمیٹی کومطمئن نہیں کرسکی تھی۔مئی 2017 میں بیان کیے گئے کمیٹی کے حتمی مشاہدات کواذیت اوردیگرظالمانہ یاتضحیک آمیز سلوک یا سزا کے خاتمے کے لیے ملکی ایجنڈے کا درجہ ملنا چاہیے۔

پاکستان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ:

☆ "اس امرکویقینی بنایا جائے کہ اہلکار۔۔۔اعلیٰ ترین سطحوں پر اذیت کے قطعی خاتمے کی توثیق کریں اوراذیت کے تمام رجحانات کی کھلے عام مذمت کریں"، اور" ایک واضح انتباہ جاری کریں کہ ایسی کاروائیوں کاارتکاب کرنے والے یااذیت میں حصہ داربننے یاشامل ہونے والے کسی بھی فردکوقانون کے سامنے ذاتی حیثیت میں جوابدہ ٹھہرایاجائے گا۔۔۔؛

☆ "اس امرکویقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں کہ تمام پولیس افسران۔۔۔کو'بذریعہ قانون' اذیت کا نشانہ بنانے سے روکا جائے، جیسا کہ ملک کے بعض حصوں میں "رائج پولیس آرڈر 2002 میں کہا گیا ہے؛

☆ ''جو پولیس افسران اذیت دینے میں ملوث ہوں ان کے خلاف مقدمہ سازی اورایسی سزاؤں یقینی بنائیں جو میثاق کے آرٹیکل 4 کے تحت اذیت دینے کے جرم کی شدت سے مطابقت رکھتی ہوں؛

☆ "اذیت پرمکمل پابندی، میثاق کی دفعات، اورفورینسک گواہی اکٹھا کرنے جیسے معاملات پرپولیس افسران اورسیکیورٹی فورسز کی تربیت کی جائے جس سے فوجداری تحقیقات کی بنیاد کے طورپراعتراف جرم کروانے پران کاانحصارکم ہوجائے گا"۔۔۔؛

☆ "ایسے لوگ جواذیت سے متعلق طرزعمل کے خلاف شکایت کریں، یا اس کی گواہی دیں اوران کے خاندانوں کوہراسانی اوردھونس ودھمکیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے موثراقدامات کویقینی بنائیں؛ ۔۔۔

☆ "پولیس کے نظام سے آزادایک ایسا طریق کارتشکیل دیا جائے جس کے پاس اذیت کے تمام الزامات کے خلاف شکایات لینے، تحقیقات کرنے اوران کاسدباب کرنے کی صلاحیت ہو؛۔۔۔

☆ ''یہ یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کریں کہ ایک مکمل آزادادارہ ایذارسانی یابرے سلوک کے تمام الزامات کی فوری، مکمل اورغیرجانبدارانہ تحقیقات کرے، کہ اس جرم میں ملوث لوگوں کے خلاف باقاعدہ مقدمے چلائے جائیں اوراگروہ قصوروارپائے جائیں تو انہیں ان کے جرائم کی نوعیت کے مطابق سزائیں سنائی جائیں؛

☆ " ایکشن ان ایڈ آف سول پاورریگولیشن اورآرمی ایکٹ 2015 میں ترمیم کرکے ماضی کے کیسز میں سزا سے دیا گیااستثناءختم کیا جائے۔۔۔

☆ ''قانون کے نفاذ کے اقدامات کے لیے پیراملٹری فورسزکااستعمال ختم کیا جائے اوریقینی بنایا جائے کہ اذیت کی شکایات کی تحقیقات ہوں اورذمہ دارلوگوں کے خلاف مقدمے چلائے جائیں۔

☆ انسداد دہشت گردی ایکٹ اوردیگر متعلقہ قوانین کوختم کیا جائے تاکہ یہ بات یقینی بن سکے کہ۔۔۔زیرحراست لوگوں کو اذیت کے خلاف قانونی تحفظ حاصل ہو۔۔۔"

☆ ایک ایسا قانون بنایا جائے جس میں ایذارسانی کی تعریف بیان کی گئی ہواورمجرموں کے لیے سزائیں تجویز کی گئی ہوں۔

حکومت کو حالیہ عالمگیرسلسلہ وارجائزے میں اذیت کے خاتمے کے لیے کی گئی سفارشات کے نفاذ کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

اضافی پیرا: پاکستان میں ضمیرکے سب سے معروف قیدی اورایذارسانی سے متاثرہ فرد بابا جان کے لیے حالات نے ایک خوشگوارکروٹ لی ہے۔ان کے چھاتی کے شدید درد کے علاج کے لیے انہیں جیل سے ہسپتال منتقل کرنے کی سول سوسائٹی کی آوازیں سیکیورٹی فورسزتک پہنچی ہیں اورانہیں گلگت میں ملٹری ہسپتال اورڈی ایچ کیومنتقل کیا گیا ہے۔ان کا اب معدے کی بیماری کا علاج ہورہا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ معروف سماجی وسیاسی کارکن کے خلاف بے بنیادمقدمہ ختم کیا جائے، ایک ایسا مقدمہ جو گلگت-بلتستان کی سیاسی قیادت کے لیے نہ ختم ہونے والی شرمندگی کا باعث بنا ہوا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

حقوق کی تحریکیں اور ریاستی طرزِ عمل

عامر رانا

پاکستان میں مذہب اور حقوق کا معاصر سلسلہ بالکل دو الگ اور مختلف تناظرات میں دیکھا جاتا ہے، بالخصوص اس لیے بھی کہ ہماری حکومت ان دونوں کے درمیان فرق روا رکھتی ہے۔ ریاست حقوق کی تحریکوں اور مذہبی تحریکات کے ساتھ مختلف طرح سے معاملات طے کرتی ہے، حقوق کی تحریکوں کو خطرے کے طور پر اور شک وشبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جبکہ مذہبی تحریکات کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے یا پھر ان کے بارے کافی برداشت روا رکھی جاتی ہے۔ حالیہ چند اقدامات اور ریاست کے جوابی طرزِ عمل نے اس تصور کو مزید پختہ کیا ہے۔ لورا لائی میں پشتون تحفظ موومنٹ کے مرکزی رہنما پروفیسر ارمان لونی کی پولیس حراست میں وفات نے خصوصاً نوجوانوں میں غم و غصے کی لہر کو مہمیز دی ہے۔ تاہم ریاست کا جوابی طرزِ عمل انتہائی محتاط رہا جیسے وہ مقتول کے بارے میں بالکل بھی ''فکرمند'' نہیں ہے۔

پشتون تحفظ موومنٹ مذہبی عسکریت پسندی کی مخالف ہے اور منطقی طور پر یہ تحریک عسکریت مخالف بیانیے کی پرچارک اور مفاہمتی عمل کی صورت گری کا حصہ ہوتی، تاہم عملاً اس کے برعکس ہوا، اور ریاست نے اسے تحریکِ طالبان پاکستان کی طرح کی ایک تحریک کی صورت بطور دشمن دیکھنا شروع کر دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ ریاست کے خلاف مزاحمت سے دستبردار ہونے والے عسکریت پسندوں کے لیے ریاست امن کی طرف واپسی کا دروازہ کھلا رکھے ہوئے ہے۔

ریاست کی نظر میں یہ فرق دراصل ہے کیا؟ ایسا کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی عسکریت پسند کسی بھی مفاہمتی عمل کے نتیجے میں فقط جان کی امان طلب کرتے ہیں، جیسا کہ احسان اللہ احسان اور پنجابی طالبان کے رہنما عصمت اللہ معاویہ کی مثال ہمارے سامنے ہے، جبکہ پشتون تحفظ موومنٹ مکمل احتساب اور شفافیت کا مطالبہ کرے گی۔

تاریخ گواہ ہے کہ عالمی یا مقامی دہشت گرد عناصر سے متاثرہ یا ان کی مدد وحمایت کی بنیاد پر انتہا پسند مذہبی تحریکات نے نہ صرف معاشرے میں نظریاتی و مسلکی خلیج کو مزید گہرا کیا ہے بلکہ ملک میں بدامنی اور انتشار کا باعث بھی بنی ہیں۔ اس کے باوجود بھی ریاست مذہبی قوتوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرتی رہی ہے اور جہاں اسے لگتا ہے کہ ان قوتوں کی ''ناراضی'' جائز ہے یا اسے کسی طور حل کیا جا سکتا ہے، وہاں ریاست نے ان کے ساتھ موزوں نظریاتی و سیاسی تعلقات بھی استوار رکھے ہیں۔

گذشتہ ماہ فوج کی معیت میں علما کا دورہ شمالی وزیرستان بھی اسی طرزِ عمل کی ایک مثال ہے جس میں کچھ کالعدم تنظیموں کے سربراہان بھی شامل تھے۔ اس دورے نے اس سوال کو بھی جنم دیا کہ جو لوگ عسکریت پسند ذہن کی نشوونما کرتے رہے ہیں، انہیں اب کس بنیاد پر اس ذہن کی اصلاح کے لیے بلایا جا رہا ہے؟ ریاست کا دعویٰ ہے کہ اس نے ان کالعدم تنظیموں کے سربراہان کو پیغامِ پاکستان جیسی متفقہ دستاویز کی تشہیر و اشاعت کے لیے اعتماد میں لیا ہے۔ یہ چیز بھی مذہبی عناصر اور ریاست کے مابین موجود باہمی اتفاقِ رائے کو ظاہر کرتی ہے۔

2017 کے فیض آباد دھرنے سے متعلق عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے سے بھی مذہبی قوتوں سے متعلق ریاستِ پاکستان کے طرزِ عمل کی تفہیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ فیصلہ عین اس وقت سامنے آیا جب ریاستی ادارے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ انہوں نے تحریکِ لبیک پاکستان کے خلاف سخت کارروائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تحریکِ لبیک اور اسٹیبلشمنٹ کا باہمی رومانس جزوقتی ثابت ہوا ہے۔ کئی بریلوی مذہبی رہنماؤں نے مقتدر حلقوں کے ساتھ قرابت کو بریلوی مسلک کے مفادات کی آبیاری کے لیے سنہری موقعے کے طور پر دیکھا۔ تحریکِ لبیک نے یہ موقع غارت کر دیا۔ اب بریلوی قیادت نہ صرف اس بات پر پریشان ہے کہ موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا بلکہ اسے اس بات کا بھی غم لاحق ہے کہ مقتدر قوتیں دوبارہ اپنے دیرینہ ساتھیوں، جو بریلوی مخالف رجحانات رکھتے ہیں کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ عدالتِ عظمیٰ نے اپنے فیصلے میں قانون کی بالادستی پر زور دیا اور کہا کہ غیر آئینی و غیر قانونی اقدامات اور کارروائیوں پر اسٹیبلشمنٹ کو استثنیٰ نہیں دیا جا سکتا۔ کیا اسٹیبلشمنٹ اس طرف بھی توجہ دے گی؟ تاریخ کی گواہی مگر اس سے مختلف ہے۔

> حقوق کی تحریکوں پر عدم اعتماد کی جڑیں مشرقی پاکستان سے جا ملتی ہیں اور سندھ، بلوچستان کی نسل اور قوم پرست تحریکوں کو بھی ہمیشہ اسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ریاست ہمیشہ ان تحریکوں سے بزورِ بازو نبرد آزما رہی ہے اور پشتون تحفظ تحریک کے ساتھ بھی اب یہی معاملہ برتا جا رہا ہے۔

اسٹیبلشمنٹ کو مذہبی قوتوں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ ان قوتوں نے اکثر اوقات اسے دھوکہ دیا ہے اور اپنی ہمدردیاں اور وفاداریاں اپنے ساتھ منسلک انتہا پسند گروہوں کے ساتھ رکھی ہیں۔ تاہم مذہبی رہنماؤں نے یہ گُر سیکھ لیا ہے اور وہ مقتدر ریاستی اداروں کے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ فریقِ ثانی بھی اس حوالے سے کسی طور کم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر دو نے باہم مل کر چلنے کے راستے نکال لیے ہیں۔ اسی سبب کئی ماہرین کا خیال ہے کہ ریاستی اداروں نے تحریکِ لبیک کو مکمل طور پر تنہا چھوڑ دیا ہے۔

جس طرح اسٹیبلشمنٹ نے تحریکِ لبیک کے ساتھ رویہ روا رکھا ہے، اس نے اسٹیبلشمنٹ کے اندرونی حلقوں میں مذہبی گروہوں سے متعلق ریاستی طرزِ عمل کے بارے میں ایک نئی بحث کو جنم دیا ہے کہ تعمیرِ قوم کے اس عمل میں ثقافتی تہذیبی عوامل کا سہارا لیا جائے۔ بظاہر اس خیال کا عملاً اطلاق سامنے نہیں آیا کیوں کہ ہنوز اسٹیبلشمنٹ اپنے سیاسی و تزویراتی مفادات کے لیے مذہبی قوتوں کو زیادہ بااعتماد اور قابلِ بھروسہ سمجھتی ہے۔ بلوچستان میں مدارس کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اندرون سندھ میں کالعدم تنظیموں کا ازسرِ نو تحرک درج بالا رائے کو مزید تقویت دیتا ہے۔

یہاں سے اس بات کا بھی بخوبی ادراک ہوتا ہے کہ پیغامِ پاکستان جیسی دستاویز کو ان تنظیموں کے ہاتھ میں کیوں تھما دیا گیا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کے بعض اراکین کا کہنا ہے کہ پشتون تحفظ تحریک کی نمو مذہبی گروہوں سے ریاست کے تعلقات پر نظرِ ثانی کے امکانات میں التوا کا باعث بنی ہے۔ حقوق کی تحریکوں پر عدم اعتماد کی جڑیں مشرقی پاکستان سے جا ملتی ہیں اور سندھ بلوچستان کی نسل اور قوم پرست تحریکوں کو بھی ہمیشہ اسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ریاست ہمیشہ ان تحریکوں سے بزورِ بازو نبرد آزما رہی ہے اور پشتون تحفظ تحریک کے ساتھ بھی اب یہی معاملہ برتا جا رہا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ میں دراصل محروم طبقات کے غم و غصے اور پریشانی میں اضافے کا باعث بننے والے سیاسی، اقتصادی، سماجی و ثقافتی اور ترقیاتی مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت و قابلیت کا فقدان ہے۔

عوامی حکومتیں بھی ان حقوق کی تحریکوں کے ساتھ افہام و تفہیم کے حوالے سے کوئی قدم اٹھانے سے گریز کرتی ہیں اور بالخصوص اس وقت جب ملک کے دفاعی اداروں کی جانب سے ان تحریکات کو قومی سلامتی کے لیے خطرے کا باعث قرار دے دیا جائے۔ حقوق کی تحریکوں کو سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ سے شکایات رہتی ہیں اور سیاسی حکومتوں سے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ حکومتیں ان کی شکایات کے ازالے کی طاقت نہیں رکھتیں۔ اسٹیبلشمنٹ حقوق کی تحریکوں سے معاملات طے کرنی کی کوشش کرتی ہے تاہم ایسی تحریکات کے ساتھ اعتماد بحالی میں اسے مشکلات کا سامنا رہتا ہے، کیوں کہ یہ تحریکیں مذہبی دائرہ کار سے باہر کام کرتی ہیں۔

(بشکریہ: تجزیات آن لائن)

تعلیم

پولیس کانسٹیبل کی فائرنگ سے طالبعلم زخمی

نوشہرہ 8 فروری 2019ء کو نوشہرہ رسالپور میں ایک پولیس کانسٹیبل کی فائرنگ سے موٹر سائیکل سوار 2 طالب علموں میں سے ایک گولی لگنے سے شدید زخمی ہوگیا، نوشہرہ پولیس کے مطابق زخمی طالب علم رسالپور میں مردان سے نوشہرہ جی ٹی روڈ کے مقام پر جارہے تھے ،ڈیوٹی پر مامور پولیس کانسٹیبل نے فائرنگ کردی ، فائرنگ سے طالبعلم کامران خان ولد سعید خان سکنہ مردان ہاتھ پر گولی لگنے سے زخمی ہوگیا۔نوشہرہ پولیس کے مطابق زخمی طالبعلم کو شدید زخمی حالت میں مردان میڈیکل کمپلیکس منتقل کردیا گیا۔نوشہرہ رسالپور میں موٹر سائیکل سواروں پر پولیس اہلکاروں کی فائرنگ کا نوٹس لیتے ہوئے ڈی پی او نوشہرہ کیپٹن (ر) منصور امان نے زخمی نوجوان کی مدعیت میں ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

(روزنامہ آج)

لائبریری کو فعال کرنے کے لیے اقدامات کئے جائیں

بصیر پور بصیر پور شہر میں سٹی روڈ پر محکمہ آرکائیو اینڈ لائبریز، حکومت پنجاب نے ایک کروڑ روپے کی لاگت سے پبلک لائبریری تعمیر کروائی ہے۔اس لائبریری کی عمارت کی تعمیر چھ ماہ قبل مکمل ہوگئی تھی۔ مذکورہ پبلک لائبریری کی عمارت کو نہ تو متعلقہ محکمہ کے حوالہ کیا گیا ہے نہ ہی اس میں سٹاف کی تعیناتی عمل میں لائی گئی ہے اور نہ ہی ضروری ساز وسامان مہیا کیا گیا ہے۔ مقامی شہریوں نے مذکورہ لائبریری کے اجراء کے لیے سیکرٹری آرکائیو اینڈ لائبریری حکومت پنجاب کو متعدد درخواستیں دی ہیں تاہم ابھی تک ان پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ مقامی شہریوں نے متعلقہ اعلیٰ حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ مذکورہ پبلک لائبریری بصیر پور کے جلد از جلد اجراء کے لیے اقدامات کئے جائیں۔

(اصغر حسین حماد)

مندر میں قائم سکول منتقل کرنے کا فیصلہ

نوشہرہ 8 فروری 2019ء کو محکمہ تعلیم خیبر پختونخوا نے 25 سال بعد نوشہرہ کے علاقہ رسالپور کے ایک ہندو مندر میں قائم گرلز پرائمری سکول قریبی سکول میں منتقل کرنے اور مندر ہندو برادری کے حوالے کرنے کا اصولی فیصلہ کیا ہے، 1993ء میں پرائمری سکول نہ ہونے پر مسلم لیگ کی صوبائی حکومت نے ہندو برادری سے صرف 6 ماہ کیلئے مندر کی اراضی حاصل کی تھی اس کے بعد اس مندر میں پرائمری سکول قائم رہا اور ہر نئی آنے والی حکومت سے اسمبلی میں اقلیتی ہندو ممبران اور وہاں پر آباد ہندو برادری ان کے حوالے کرنے کی استدعا کرتی رہی، یہاں تک کے 25 سال گزر گئے۔ اب صوبائی حکومت نے ایک مرتبہ پھر مندر کے سکول کو کسی قریبی پرائمری سکول یا پھر کرایہ کی بلڈنگ میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر نوشہرہ کو مندر خالی کرنے کے احکامات جاری کردیئے ہیں یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ احکامات 2009ء میں اے این پی کی صوبائی حکومت اور اس کے بعد پی ٹی آئی کی سابق حکومت نے بھی جاری کیے تھے۔

(روزنامہ ایکسپریس)

بچے

ہسپتال میں بچے کی ہلاکت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ

باجوڑ 7 فروری 2019ء کو باجوڑ کے ہیڈکوارٹر ہسپتال خار میں بچے کے مرنے کے خلاف یوتھ جرگہ اور عوام نے احتجاجی مظاہرہ کیا، مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے یوتھ جرگہ کے رہنماؤں چیئرمین سرتاج عزیز، خائستہ رحمٰن، جاوید تندر، واجد علی، نثار باز، ثناءاللہ، صدیق اکبر اور دیگر کا کہنا تھا کہ چلڈرن وارڈ میں بچے کی موت وارڈ انتظامیہ کی غفلت کے باعث پیش آئی۔ مظاہرین نے مطالبہ کیا کہ غفلت کا مظاہرہ کرنے والے ڈاکٹر اور اہلکاروں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے۔ دوسری جانب ہیڈکوارٹرز ہسپتال خار باجوڑ کے ایم ایس ڈاکٹر محمد نور سے رابطہ کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ بچے کی پیدائش دو دن قبل ہوئی تھی اور وہ (انکیوبیٹر) میں زیر علاج تھا اور ایسے بچے حساس ہوتے ہیں اور اس وارڈ میں نومولود بچے نیم مردہ حالت میں داخل ہوتے ہیں جو کسی بھی وقت موت کے منہ میں جاسکتے ہیں، ایم ایس ڈاکٹر محمد نور نے بتایا کہ واقعہ کی انکوائری کا حکم دیا گیا ہے۔

اگر سٹاف کی غفلت ثابت ہوگئی تو کاروائی کی جائے گی۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر باجوڑ نے مظاہرین سے مذاکرات کیے اور واقعہ کی شفاف اور غیر جانبدارانکوائری کا حکم دیا۔

(روزنامہ مشرق)

کمسن بچی سے مبینہ زیادتی ملزم گرفتار

ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نواحی گاوں 697/39 میں گاؤں کے اوباش نوجوان نے آٹھ سالہ کمسن بچی کو مبینہ زیادتی کا نشانہ بنایا اور ویرانے میں پھینک کر فرار ہوگیا۔اطلاع ملنے پر والدین نے متاثرہ بچی کو تشویش ناک حالت میں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال ٹوبہ ٹیک سنگھ منتقل کیا جہاں اسے طبی امداد دی جارہی ہے۔دوسری جانب پولیس نے والد کی درخواست پر بچی کا میڈیکل لیگل حاصل کرنے کے بعد ملزم کاشف کے خلاف زیادتی کا مقدمہ درج کر کے گرفتار کرلیا ہے۔ واقعہ کا نوٹس لیتے ہوئے ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر صادق علی ڈوگر نے متاثرہ خاندان کو انصاف کی یقین دہانی کروائی ہے۔ یہ واقعہ 22 جنوری کو پیش آیا۔

(اعجاز اقبال)

بچوں کے حقوق کا مختصر تعارف

ہر بچے کو دیگر انسانوں کی طرح ناقابل انتقال حقوق حاصل ہیں۔ پاکستان نے بچوں کے حقوق کے میثاق کی توثیق نومبر 1990 میں کی۔ اس میثاق کے تحت پاکستان پر یہ لازم ہے کہ یہ اپنے بچوں کے لیے ان حقوق کی ضمانت دے۔ بچوں کے حقوق کا عالمی میثاق (سی آر سی) بچوں کو درج ذیل بنیادی حقوق فراہم کرتا ہے:۔

زندگی کا حق	نقصان دہ پیشوں اور معاشی استحصال سے تحفظ کا حق
ممکنہ حد تک بہترین صحت اور صحت کی سہولیات کا حق	خلوت کا حق
مفت ابتدائی تعلیم کا حق	آزادی اظہار کا حق
پیدائش کے اندراج کا حق	فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق
جنسی استحصال (بشمول جسم فروشی) اور جنسی زیادتی سے تحفظ کا حق	نام، قومیت اور خاندانی تعلقات اور والدین کی جانب سے نگہداشت کا حق
ایک ایسے معیار زندگی کا حق جو بچے کو ترقی کرنے میں مدد دے	ان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے فیصلوں میں شرکت کا حق
ہر معذور بچے اور نوجوان فرد کا مکمل زندگی اور معاشرے میں بھرپور شرکت کا حق	15 برس سے کم عمر کے تمام بچوں کے لئے جنگ میں براہ راست شرکت سے روکے جانے کا حق
ایذا رسانی یا کسی اور ظالمانہ، غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک یا سزا سے تحفظ کا حق	آرام کرنے، کھیلنے اور فراغت کا حق
اقلیتی برادریوں سے تعلق رکھنے والے بچوں اور نوعمر افراد کو اپنی ثقافت، مذہب اور زبان سے استفادہ حاصل کرنے سے نہ روکا جائے	لوگوں سے ملنے اور اجتماعات میں شرکت کا حق
چھینے جانے، فروخت کئے جانے یا سمگل ہونے سے تحفظ فراہم کرنے کا حق	خاندان سے علیحدہ کئے جانے والے بچوں کے تحفظ اور مدد کا حق

ملکی سطح پر موجودہ قانونی ڈھانچہ

چودہ برس سے کم عمر بچے کو کسی فیکٹری یا دکان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔	آئین پاکستان [آرٹیکل۔11(3)]
ریاست: شادی، خاندان، ماں اور بچے کو تحفظ فراہم کرے گی۔	[آرٹیکل۔35]
ریاست اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی کہ بچوں کو ان پیشوں میں ملازم نہیں رکھا جائے گا جو ان کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتے۔	[آرٹیکل۔37(e)]

14 برس سے کم عمر کسی بھی بچے کو ماسوائے اپنے خاندان کے ہمراہ، ایک معیاری ماحول کے تحت، کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ (بچوں کی ملازمت کا ایکٹ 1991۔ (ای سی اے 1991)

14 برس سے کم عمر کے تمام بچوں کے لیے مندرجہ ذیل پیشوں میں کسی بھی قسم کے حالات میں کام کرنے کی ممانعت ہے۔ بیڑی بنانا، قالین بافی، سیمنٹ کی تیاری، بشمول سیمنٹ کی پیکنگ، کپڑے کی چھپائی، ماچس، دھماکہ خیز مواد اور آتش بازی کے سامان کی تیاری، ابرق کی کٹائی، صابن کی تیاری، اون کی صفائی، تعمیراتی صنعت، سلیٹ پنسلوں کی تیاری (بشمول پیکنگ)، سنگ سلیمانی سے بنی ہوئی مصنوعات کی تیاری، مصنوعات کی تیاری میں زہریلی دھاتوں اور مادوں مثال کے طور پر سیسہ، پارا، مینگنیز، کرومیم، کیڈیم، بینزین، کیڑے مار ادویات اور اسبسٹاس کا استعمال۔ (ای سی اے 1991)

ضابطہ تعزیرات پاکستان، جنسی تشدد، خلاف فطرت جرائم مثال کے طور پر غیر فطری جنسی اختلاط، چودہ برس سے کم عمر فرد کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے اغوا کرنے، غلامی اور جنسی اختلاط کے بدلے دی جانے والی مراعات، کم سن لڑکی کو خریدنا تاکہ اس کو زبردستی جنسی اختلاط پر مجبور کیا جاسکے، جسم فروشی کی غرض سے کم سن بچی کو خریدنے کے یا فروخت کرنے اور والدین کی جانب سے 12 سال سے کم عمر بچے کو ترک کر دینے کو جرم قرار دیتا ہے۔

بچے اور جرائم

- جرائم سے متعلقہ مقدمات میں ملوث بچوں پر مقدمات بچوں کے لئے مختص مخصوص عدالتوں میں چلائے جائیں۔
- انہیں زنجیریں یا ہتھکڑیاں نہیں لگائی جانی چاہئیں۔
- انہیں حراست کے دوران بالغ قیدیوں سے الگ رکھا جانا چاہئے۔
- ان کے مقدمات کی سماعت چار (4) ماہ میں مکمل ہوجانی چاہئے۔
- انہیں قید بامشقت یا موت کی سزا نہیں دی جاسکتی۔
- ان سے حراست کے دوران مشقت نہیں لی جاسکتی۔
- ریاست کو انہیں مفت قانونی معاونت فراہم کرنی چاہئے۔
- پروبیشن افسر کو ان کے پس منظر سے متعلق رپورٹ تیار کرنی چاہئے جو جج کو پیش کی جائے۔

خاندان کے سہارے سے محروم بچے

خاندان کے سہارے سے محروم بچوں کے بارے میں تین صوبوں میں مختلف قوانین نافذ ہیں۔ ان کے تحفظ کے لیے ان قوانین کے تحت مخصوص ادارے قائم کئے جانے چاہئے۔

پنجاب کا مفلس اور نظر انداز کئے گئے بچوں کا ایکٹ (Punjab Destitute and Neglected Children Act 2004) ایک بنیادی قانون ہے جسے پنجاب میں خاندان کے سہارے سے محروم بچوں کے تحفظ کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس قانون کے تحت خاندان کے سہارے سے محروم بچوں کی بازیابی، بحالی اور تحفظ کے لئے چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر بیورو قائم کیا گیا ہے۔

خیبر پختونخوا کا چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر ایکٹ 2010، چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر کمیشن (سی پی ڈبلیو سی) جو کہ اس قانون کے تحت تشکیل دیا گیا تھا، کے ذریعے خیبر پختونخوا میں خطرات سے دوچار بچوں کی دیکھ بھال، تحفظ، پرورش، فلاح، تربیت، تعلیم، آبادکاری کی ضمانت دیتا ہے۔

سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی ایکٹ 2011، سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی قائم کرنے کا تقاضہ کرتا ہے تاکہ ان بچوں کے حقوق کو یقینی بنایا جاسکے جنہیں خاص تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں قانونی لحاظ سے لڑکیوں کی شادی کے لیے کم از کم عمر 16 برس اور لڑکوں کی 18 برس ہے۔ کم سن بچوں کی شادی کرانے میں ملوث کوئی بھی شخص جرم کا ارتکاب کر رہا ہے اور وہ قانون کے تحت لائق سزا ہے۔

(کم عمری کی شادی کی ممانعت کا ایکٹ (Restraint of Child Marriage Act 1929

کم عمری کی شادی کو فروغ دینے والے رسم و رواج مثلاً

سوارا، وٹہ سٹہ خلاف قانون قرار دیئے جا چکے ہیں۔

(عورتوں کے خلاف رسوم ورواج (فوجداری قانون میں ترمیم) کا ایکٹ (Anti-women Practices (Criminal law Amendment) Act, 2011

نوعمر بچوں کا نظام انصاف

جرائم کے مقدمات میں ملوث بچوں سے بین الاقوامی اور ملکی قوانین کے مطابق برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ زیادہ تر بچوں کو پولیس کی حراست اور جیل کے اندر تشدد اور ناروا سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان کے مقدمات کی سماعت مقررہ طریقہ ہائے کار کے مطابق نہیں ہوتی۔

خاندان کے سہارے سے محروم بچے

ریاست خاندان کے سہارے سے محروم بچوں کو مناسب تحفظ فراہم نہیں کرتی اور نتیجتاً زیادہ تر بچے گلیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں جس کے باعث بے گھر بچوں کی تعداد میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ ایسے بچوں کے لیے ''بچہ گھر'' انسانی حقوق کے بنیادی معیار پر پورا نہیں اترتا، جس کے نتیجے میں بچے مزید استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔

کم عمری کی شادی

رسم ورواج کے باعث ہزاروں بچے کم عمری کی شادی کا شکار ہوتے ہیں۔

ہنگامی صورتحال سے دوچار بچے

قدرتی آفات پر قابو پانے کے ناقص نظام کے باعث ہزاروں بچوں کو بحرانی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے چونکہ انہیں صحت کی سہولیات میسر نہیں ہوتیں اور انہیں ناروا سلوک، غذائیت کی کمی، سماجی تنہائی اور دیگر لاتعداد مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

نقل مکانی کا شکار بچے

گزشتہ کچھ برسوں میں ملک کے مختلف علاقوں سے لوگوں کو اندرون ملک نقل مکانی کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسا کہ سوات، وزیرستان، کوہلو، خضدار اور ڈیرہ بگٹی سے کثیر تعداد میں لوگوں نے فوجی آپریشن کے دوران اندرون ملک نقل مکانی کی۔ نقل مکانی کے دوران بچوں کی نفسیات اور تعلیم بہت متاثر ہوتی ہے۔ ہماری حکومتوں اور والدین کو اس بات پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اس سارے عمل میں بچوں کی تعلیم کا کم سے کم حرج ہو اور اُن کی نفسیات پر کم سے کم منفی اثرات مرتب ہوں۔

معذوری کا شکار بچے

معذوری کا شکار بچوں کو قانون کے تحت موثر تحفظ فراہم نہیں کیا جا رہا۔ کوئی بھی قانون خصوصی طور پر محض ان کے حقوق اور ضروریات پر پورا نہیں اترتا۔

بچوں کے حقوق سے متعلق کوائف

ملک میں بچوں کے حقوق سے متعلقہ کوائف کی جمع بندی کا کوئی مناسب نظام موجود نہیں جس کے باعث شواہد پر مبنی پالیسی اور قانون سازی کا کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ (چائلڈ لیبر، بے گھر بچوں اور ایڈز کا شکار بچوں سے متعلق تازہ ترین اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں)۔

بچوں کی فلاح و بہبود کا مجموعی طور پر ناقص نظام

خیبر پختونخوا کے سوا صوبائی سطح پر بچوں کے تحفظ سے متعلق کوئی بھی پالیسی تشکیل نہیں دی گئی۔ موجودہ قوانین کا نفاذ برے طریقے سے کیا جاتا ہے اور چند اہم علاقوں میں مناسب قوانین جو کہ بچوں کے تحفظ کے ایک مضبوط نظام کے لئے ضروری ہیں، موجود نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر:۔

- جسمانی سزا سے متعلق کوئی قانون موجود نہیں جو کہ اس عمل کے مکمل خاتمے کے لیے ضروری ہے۔
- بلوچستان میں مخصوص حالات میں بچوں کے تحفظ اور فلاح سے متعلق بل کی ابھی تک منظوری نہیں دی گئی۔
- گھریلو اور زراعت سے متعلقہ کام کو ای سی اے 1991 کی بچوں کے لیے ممنوعہ پیشوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔

مندرجہ ذیل شعبوں میں ایڈووکیسی کی ضرورت ہے

- چاروں صوبوں میں بچوں کے تحفظ سے متعلق پالیسی کی تشکیل اور اس کا نفاذ، خاص طور پر وہ جن کا تعلق نوعمر بچوں کے نظام انصاف، مزدور پیشہ بچوں/ بے گھر بچوں کی ملازمت سے ہو۔
- بچوں کے حقوق کا میثاق (سی آر سی) اور دیگر بین الاقوامی ضابطوں سے مطابقت، بچوں کے تحفظ سے متعلق تمام قوانین کا جائزہ لینا اور ان میں ترمیم کرنا اور جہاں ضرورت ہو وہاں نئے قوانین متعارف کروانا۔
- بچوں کی فلاح اور ترقی کے صوبائی کمیشن کو ہر صوبے میں بااختیار بنانا۔
- بچوں کے تحفظ سے متعلق اقدامات کے لیے زیادہ بجٹ مختص کرنا۔
- ہر بچے کے لئے معیاری لازمی تعلیم کی فراہمی کو یقینی بنانا۔
- بچوں کے تحفظ سے متعلق قوانین اور طریقہ ءکار کے حوالے سے سماجی سطح پر آگاہی فراہم کرنا۔
- بچوں سے زیادتی کے واقعات کی روک تھام کے لیے مقامی سطح پر تحفظ کے لئے کمیٹیاں تشکیل دینا۔
- متبادل نگہداشت کے کم از کم معیار کو بہتر بنانا اور انہیں تمام پالیسیوں میں شامل کرنا۔
- بے گھر بچوں کے تحفظ کے لیے روک تھام، مداخلت اور بحالی نو کے طرائق کار متعارف کروانا۔

سفارشات

- بچوں کے حقوق سے متعلق معلومات نہ صرف نصاب کا حصہ ہوں بلکہ کہانیوں اور ڈرائنگ کی صورت میں انہیں ذہن نشین کرائی جائیں۔
- پولیو وائرس کے خاتمے اور پولیو سے پاک پاکستان کے حصول کے لیے وفاقی اور صوبائی سطح پر کوششیں تیز کی جائیں۔ تاکہ جلد از جلد تک اس مرض میں نجات پائی جا سکے۔
- تعلیمی بجٹ میں اضافہ کیا جائے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ اسکول جانے کی عمر کے تمام بچوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنے والے رسمی اسکولوں تک رسائی ملے۔ بچوں کو اسکول جانے پر قائل کرنے کے لیے ایک سازگار ماحول بھی قائم کیا جائے۔
- بچوں کی گھریلو مشقت کو ایک خطرناک پیشہ قرار دیا جائے اور اس کی روک تھام کے لیے سخت اقدامات کیے جائیں۔ بچوں کی مشقت کے منظم خاتمے کے لیے درکار درست پالیسی سازی کے لیے ایک چائلڈ لیبر سروے کا انعقاد کیا جائے۔
- ملک بھر میں پیدائش کے مفت اندراج کے حصول کے لیے حکمت عملی اور تمام صوبوں میں لڑکیوں کی شادی کی عمر کو 18 سال تک بڑھانے کے لیے قوانین کی منظوری اور نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔
- بچوں کے نظام انصاف کے ایک ایسے ڈھانچے کی بطور قومی ترجیح منظوری دی جائے جو بچوں کے حقوق کے بین الاقوامی اصولوں پر پورا اترتا ہو تاکہ ہمارے بچوں کو نظام انصاف میں پائی جانے والی خامیوں سے تحفظ فراہم کیا جا سکے اور مقدمے کی سماعت سے پہلے بچوں کی طویل حراست اور نوعمر بچوں کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کی روک تھام کی جا سکے۔ اس کے علاوہ ایسے قیدیوں کی پھانسی کی سزا ختم کی جائے جو جرم کے ارتکاب کے وقت کم عمر تھے۔
- خصوصی بچوں کی سماجی اور معاشی ترقی کے لیے خصوصی پالیسی تشکیل دی جائے۔ اس کے علاوہ ملک میں خصوصی بچوں کی درست تعداد سے متعلق کوائف اکٹھے کیے جائیں۔

عورتیں

عزت کے نام پر لڑکا لڑکی قتل

کوہاٹ 4فروری2019ءکونورآباد بہزادی کے علاقے میں رونما ہونے والے دوہرے قتل کے واقعے میں بھائی نے اپنی بہن کو اس کے دوست سمیت قتل کردیا۔اطلاعات کے مطابق کوہاٹ کے علاقہ ڈھل بہزادی کے موضع نورآباد میں ملزم معراج خان ولدعبدالرحمان نے اپنی ہمشیرہ مسماۃ نوشیدہ کو گھر کے کمرے میں اسرافیل نامی مرد کے ساتھ دیکھ کر دونوں پر فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں وہ موقع پر جاں بحق ہوگئے، واقعے کی اطلاع تھانہ محمد ریاض شہید پولیس کو ملی تو پولیس نے فوری طور پر جائے وقوعہ پر پہنچ کر دوہرے قتل کی اس واردات میں ملوث ملزم معراج خان کو موقع پر آلہ قتل سمیت گرفتار کرلیا۔ پولیس نے مقدمہ درج کرکے تفتیش شروع کردی۔ (روزنامہ آج)

صنفی امتیاز کے خاتمے تک معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا

حیدرآباد 31جنوری کو جامعہ سندھ کے انسٹیٹیوٹ آف جینڈر اسٹڈیز کی جانب سے خواتین کی بہبود میں نیشنل کمیشن آن دی اسٹیٹس آف ویمن کا کردار کے زیرعنوان ایک روزہ آگاہی سیمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت شیخ الجامعہ سندھ پروفیسر ڈاکٹر فتح محمد نے کی جبکہ مہمان خصوصی چیئرپرسن نیشنل کمیشن آن دی اسٹیٹس آف وویمن، منسٹری آف ہیومن رائٹس حکومت پاکستان خاور ممتاز تھیں جنہوں نے کہا کہ نیشنل کمیشن آن دی اسٹیٹس آف ویمن کی جانب سے خواتین کی بہبود کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں۔سیمینار سے ڈاکٹر عرفانہ ملاح، ڈاکٹر مصباح قریشی ودیگر نے خطاب کیا۔وائس چانسلر فتح محمد نے کہا کہ کوئی بھی ملک خواتین کے اشتراک کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا۔دنیا میں انہی ممالک نے ترقی کی ہے، جنہوں نے خواتین کو معیاری تعلیمی ماحول کے ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔انہوں نے مزید کہا کہ اس جدوجہد دور میں بھی صنفی امتیاز کا رویہ ختم نہیں ہوسکا۔خواتین کو جو اہمیت ملنی چاہیے وہ نہیں دی جارہی۔خواتین کی کثیر تعداد آج بھی تعلیم کے زیور اور بنیادی حقوق سے محروم ہے۔اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے خاور ممتاز نے این سی ایس ڈبلیو کے قیام کی تاریخ، مقاصد، کارکردگی، کام کرنے کے طریقہ کار، ریسرچ، مانیٹرنگ سسٹم اور ترجیحات کے متعلق تفصیلی آگاہی دی۔ڈاکٹر عرفانہ ملاح نے کہا کہ این سی ایس ڈبلیو کی جانب سے خواتین کی بھلائی کے لیے کی گئی کوششیں قابل تعریف ہیں۔اس موقع پر مقررین نے سیمینار میں شرکت کرنے والے طلباء اور طالبات کے سوالات کے جوابات بھی دیئے۔تقریب میں این سی این ڈبلیو کے پروگرام آفیسر ایم خالد عمران، سمیت شعبہ سماجی علوم کی ڈین پروفیسر زرین عباسی، سوٹا کے صدر نیک محمد شیخ، جامعہ کے سینئر اساتذہ پروفیسر رابعہ میمن، پروفیسر انیلہ ناز، پروفیسر امر سندھو، ڈاکٹر حاکم علی، آفتاب راجڑ کے علاوہ طلباء اور طالبات کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

(لالہ عبدالحلیم)

بااثر افراد کا 13 سالہ لڑکی کا گینگ ریپ

جہلم جہلم میں بااثر افراد نے 13 سالہ لڑکی کو اغوا کے بعد گینگ ریپ کا نشانہ بنایا اور تشویشناک حالت میں ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔متاثرہ لڑکی نے پولیس کو بتایا کہ وہ اپنے مکان میں موجود تھی کہ صبح کے وقت 2 افراد آئے اور اسے زبردستی اٹھا کر ویرانے میں لے گئے، جہاں لڑکی کے ساتھ گینگ ریپ کیا گیا اور ملزمان انہیں تشویشناک حالت میں وہاں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔متاثرہ لڑکی کے والد نے میڈیا کو بتایا کہ لڑکی کو گھر سے اغوا کرکے نامعلوم مقام پر گینگ ریپ کا نشانہ بنایا گیا۔انہوں نے پولیس پر الزام لگایا کہ تھانہ دینہ کی پولیس متاثرین سے کسی قسم کا تعاون نہیں کررہی اور پولیس ملزمان کے بااثر ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف کارروائی سے گریزاں ہے۔لواحقین کا مزید کہنا تھا کہ پولیس نے مقدمہ تو درج کرلیا مگر صلح کے لیے دباؤ ڈالا جارہا ہے۔بعدازاں متاثرہ لڑکی کو میڈیکل کے لیے جہلم کے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال منتقل کیا گیا جہاں ان کے ساتھ گینگ ریپ کی تصدیق ہوگئی۔پولیس نے متاثرین کی شکایت پر ایک ملزم عامر کو گرفتار کرلیا جبکہ دوسرے ملزم جاوید شاہ کو آخری اطلاعات آنے تک گرفتار نہیں کیا جاسکا تھا۔پولیس کے مطابق نمونے ٹیسٹ کے لیے فرانزک لیب بھیجے گئے ہیں اور ان کی رپورٹ آنے کے بعد مزید کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔گزشتہ سال جنوری میں جہلم کی تحصیل دینہ میں ہی 8 سالہ بچی کے ساتھ ریپ کرنے کے الزام میں ایک شخص کو گرفتار کیا گیا تھا جبکہ بچی کی ابتدائی میڈیکل رپورٹ میں زیادتی کی تصدیق ہوگئی تھی۔ (بشکریہ: ڈان اردو)

شوہر نے بیوی کا گلا گھونٹ کر مار دیا

حیدرآباد سچل سرمست کالونی میں کاشف نامی نوجوان نے مبینہ طور پر اپنی بیوی کو گلا گھونٹ کر قتل کردیا۔پولیس نے ملزم کو گرفتار کرلیا۔سچل سرمست کالونی ہوسٹری کی رہائشی ثمرہ نامی خاتون کی لاش اس کے گھر سے برآمد ہوئی جسے گلا دبا کر قتل کردیا گیا۔اطلاع ملنے پر متعلقہ تھانے کی پولیس موقع پر پہنچ گئی اور ثمرہ رخسار کی لاش سول ہسپتال منتقل کی گئی۔ثمرہ کی چھ ماہ قبل کاشف سے شادی ہوئی تھی۔ثمرہ کی والدہ نے بتایا کہ اس کی بیٹی کی چھ ماہ قبل ہی شادی ہوئی تھی اس دوران اس کی بیٹی نے کئی بار گھر فون کرکے شکایت کی تھی کہ اس کے سسرال والے اس پر تشدد کرتے ہیں۔گزشتہ رات بھی تقریباً 2 بجے ثمرہ کا فون آیا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ وہ اسے حیدرآباد آکر اپنے گھر واپس لے جائے انہوں نے الزام عائد کیا کہ ثمرہ کو اس کے شوہر کاشف اور سسرال والوں نے مل کر قتل کیا ہے۔انہیں انصاف دیا جائے۔بعدازاں پولیس کا کہنا ہے کہ گھریلو تنازعہ پر قتل کی جانے والی ثمرہ کے شوہر کاشف کو گرفتار کرلیا ہے جس سے تفتیش جاری ہے۔واقعہ 27 جنوری کو پیش آیا تھا۔ (لالہ عبدالحلیم)

رشتہ سے انکار پر طالبہ کا قتل

نوشہرہ 2فروری2019ءکونوشہرہ کینٹ کے انتہائی حساس شاپنگ سنٹر میں نجی یونیورسٹی نوشہرہ میں ایم فل کے طالب علم نوجوان نے اپنی کلاس فیلو طالبہ کو فائرنگ کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا، قاتل نوجوان نے مقتولہ کا رشتہ مانگا، رشتہ نہ ملنے پر دل برداشتہ ہوکر گھر والوں کے سامنے فائر کرکے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔سکیورٹی فورسز نے بروقت کاروائی کرتے ہوئے ملزم کو اسلحہ سمیت گرفتار کرلیا، پولیس کے مطابق نوشہرہ کینٹ میں واقع بیکری میں شاپنگ کرنے والی جواں سال دوشیزہ مسماۃ گلالئی نجی یونیورسٹی میں ایم فل کی طالبہ تھی۔گھر والوں کے ساتھ مقامی ہوٹل میں کھانے پر آئی ہوئی تھی مقتولہ کے ماموں ممتاز قانوندان محمد اشفاق احمد خان ایڈوکیٹ کی مدعیت میں ملزم کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا، پوسٹ مارٹم کے بعد مقتولہ کی نعش ورثاء کے حوالے کردی گئی۔ (روزنامہ آج)

شوہر نے بیوی کو قتل کردیا

پشاور 31جنوری2019ءکوتھانہ پھندو کے علاقے توحید کالونی گل آباد نمبر3 میں شوہر نے رقم کے تنازعے پر گھر کے اندر اندھا دھند فائرنگ کرکے اپنی بیوی کو قتل کردیا، گزشتہ روز تھانہ پھندو کے علاقے توحید کالونی گل آباد میں رہائش پذیر شخص ممتاز ولد گلاب دین نے 18 ہزار روپے کے تنازعے پر اپنی بیوی مسماۃ صفیہ بی بی دختر شمس الرحمان پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی جس کی وجہ سے وہ موقع پر دم توڑ گئی۔(روزنامہ آج)

سپریم کورٹ میں مختاراں مائی کی نظرثانی درخواست سماعت کیلئے مقرر

مظفرگڑھ مختاراں مائی کی پنچایت کے حکم پر زیادتی کے معاملے پر نظرثانی درخواست سپریم کورٹ میں سماعت کے لیے مقرر کردی گئی۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف مختاراں مائی کی نظرثانی درخواست پر سماعت کے لیے جسٹس گلزار احمد کی سربراہی میں 3 رکنی بینچ تشکیل دے دیا گیا۔ عدالت عظمیٰ کا بینچ بدھ کو درخواست کی سماعت کرے گا جس کے لیے مختاراں مائی کے وکیل اعتزاز احسن کو نوٹس جاری کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ جون 2002 میں مختاراں مائی کو، ان کے چھوٹے بھائی کے مخالف قبیلے کی خاتون سے مبینہ ناجائز تعلقات پر پنچایت کے حکم پر اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ انہوں نے 14 ملزمان پر زیادتی میں ملوث ہونے کا الزام لگایا تھا اور انسداد دہشت گردی کی عدالت نے اسی سال اگست میں 6 ملزمان کو سزائے موت سنائی تھی، جن میں سے 4 ریپ میں ملوث اور 2 پنچایت کا حصہ تھے جبکہ دیگر 8 افراد کو بری کر دیا گیا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کے ملتان بینچ نے 2005 میں چھ میں سے 5 ملزمان کو نظرثانی درخواستوں پر فیصلہ سناتے ہوئے بری کر دیا تھا، جبکہ ملزم عبدالخالق کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ پانچوں ملزمان کی بریت کے خلاف مختاراں مائی نے سپریم کورٹ میں اپیلیں دائر کی تھیں جس پر سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھتے ہوئے اپریل 2011 میں اپیلیں مسترد کر دی تھیں۔ مختاراں مائی نے اسی سال مئی میں سپریم کورٹ میں نظرثانی درخواستیں دائر کی تھیں جس پر 8 سال بعد بدھ کو سماعت ہوگی۔ اپنی نظرثانی کی درخواست میں مختاراں مائی نے کہا تھا کہ سپریم کورٹ کی جانب سے دیا گیا یہ فیصلہ انصاف کی بہت بڑی ناکامی تھی۔

(بشکریہ: ڈان اردو)

بچی کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے، فوجی اہلکار کی عدم گرفتاری کا معاملہ

گلگت بلتستان ایک فوجی اہلکار جس نے 14 سالہ لڑکی کو مبینہ طور پر جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا، کو ابھی تک گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ ابتدائی معلوماتی رپورٹ کے مطابق، جلال آباد، گلگت کی رہائشی ایک 14 سالہ لڑکی 22 جنوری کو اپنی والدہ کے ساتھ ضلعی ہیڈ کوارٹر ہسپتال (ڈی ایچ کیو) اپنا علاج کروانے گئی جہاں ان کی ملاقات ضلع استور کے رہائشی ظہیر اقبال سے ہوئی جس نے انہیں بتایا کہ وہ پاکستان کی فوج کا اہلکار ہے۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق، اس نے لڑکی کی والدہ کو کہا کہ چونکہ وہ فوج میں تعینات ہے اس لیے وہ کمبائنڈ ملٹری ہسپتال گلگت سے بچی کا مفت علاج کروا سکتا ہے۔ اطلاعات کے مطابق، اس نے بچی کی والدہ کو بچی اپنے ساتھ لے جانے پر قائل کر لیا۔ ملزم نے کہا کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر بچی کو واپس ڈی ایچ کیو لے آئے گا۔ جب ظہیر اقبال بچی کو واپس لے کر نہ آیا تو بچی کی والدہ نے ڈی ایچ کیو ہسپتال کی انتظامیہ کو معاملے سے آگاہ کیا۔ جس پر ڈی ایچ کیو کے ڈاکٹر فرمان اللہ نے شہر کی پولیس کو لاپتہ لڑکی کے بارے میں اطلاع دی۔ پولیس کی ایک ٹیم نے بچی کی والدہ کا بیان قلمبند کیا اور واقعے کی تحقیقات شروع کر دیں۔ 23 جنوری کو، پولیس کو اطلاع ملی کہ بچی کو کسی نامعلوم آدمی نے ڈی ایچ کیو ہسپتال چھوڑا ہے۔ پولیس کی ایک ٹیم ہسپتال پہنچی جہاں موجود بچی نے انہیں بتایا کہ ظہیر اقبال نامی شخص اسے سینما چوک کے قریب واقع سکائی ویز ہوٹل لے گیا تھا جہاں اس نے اسے کئی بار جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ متاثرہ بچی کے مطابق، ظہیر نے اگلے دن اپنے ایک رشتہ دار کو بلایا جس نے اسے ڈی ایچ کیو ہسپتال چھوڑا۔ پولیس نے متاثرہ بچی کا بیان قلمبند کرنے کے بعد سکائی ویز ہوٹل کی انتظامیہ سے رابطہ کیا جنہوں نے بتایا کہ ان کے ہوٹل میں جو شخص بچی کو لایا تھا اس اپنی شناخت ظہیر اقبال کے نام سے کروائی تھی اور خود کو ضلع استور کا رہائشی بتایا تھا۔ سٹیشن ہاؤس آفیسر (ایس ایچ او) سید مرتضیٰ حسین نے بتایا کہ پولیس نے ملزم کے خلاف جنسی زیادتی کا مقدمہ درج کر لیا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ پولیس نے فوج اور ملٹری انٹیلیجنس سے رابطہ کیا ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ ظہیر اقبال کو پولیس کے حوالے کیا جائے یا اس کے خلاف ملٹری قانون کے مطابق کارروائی جائے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ملٹری انٹیلیجنس نے ان سے کیس کا مکمل ریکارڈ لیا ہے اور اب وہ ان کے جواب کے منتظر ہیں۔ ایس ایچ او نے مزید بتایا کہ متاثرہ لڑکی ان کی تحویل میں ہے اور اس کا طبی معائنہ کروایا گیا ہے اور ڈی این اے رپورٹ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ متاثرہ لڑکی کو بعد میں دارالامان منتقل کیا جائے گا جہاں وہ تحقیقات مکمل ہونے تک رہے گی۔ ایس ایچ او کا کہنا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ فوج خود ظہیر اقبال کے خلاف تحقیقات شروع کر دے۔ دوسری طرف بچی کو خواتین پولیس اسٹیشن گلگت میں منتقل کر دیا گیا ہے جسے مقامی انتظامیہ اور پولیس نے دارالامان قرار دیا ہے کیونکہ جی بی میں ایسے متاثرین کے باقاعدہ دارالامان نہیں ہے۔ خواتین پولیس اسٹیشن جی بی کے مطابق، مقامی انتظامیہ، پولیس اور عدالتیں عام طور پر ایسے متاثرین کو پناہ کے لیے خواتین پولیس اسٹیشن بھیجتے ہیں مگر ان متاثرین کو نہ تو کھانا اور کپڑے دیے جاتے ہیں اور نہ ہی انہیں سرد موسم سے بچانے کے لیے کوئی بندوبست ہوتا ہے۔ اس صورتحال کا سامنا اس بچی کو کرنا پڑ رہا ہے۔ بچی شدید سرد موسم میں رہ رہی ہے اور اس کے گرم کپڑوں اور کھانے کا کوئی بندوبس نہیں۔ اسے فوری طور پر کھانے اور کپڑوں اور اگر اسے طویل عرصہ کے لیے رکھا جاتا ہے تو اس صورت میں اسے ایک باقاعدہ دارالامان کی ضرورت ہوگی۔

(اسرارالدین اسرار)

13 سالہ رمشا کے قتل کے خلاف علامتی بھوک ہڑتال

حیدرآباد پاکستان پیپلز پارٹی شہید بھٹو لیڈیز ونگ کی جانب سے تیرہ سالہ معصوم لڑکی رمشا وسان کے بہیمانہ قتل کے خلاف لیڈیز ونگ کی صوبائی صدر فیروزہ لاشاری کی قیادت میں حیدرآباد پریس کلب کے سامنے علامتی بھوک ہڑتال کی گئی جس میں ایڈووکیٹ عروسہ بلوچ، غنوی سندھی، سائرہ گل، ناہید، رضوان، حمیدہ خان، فاطمہ عمران و دیگر خواتین نے شرکت کی۔ اس موقع پر مذکورہ خواتین نے کہا کہ سندھ میں خواتین سے ناانصافیاں ہو رہی ہیں اور ان کا قتل عام معمول بن چکا ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ انہوں نے چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ سے مطالبہ کیا کہ وہ رمشا وسان کے بہیمانہ قتل کا نوٹس لے کر قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائیں بصورت دیگر ہم سندھ کی خواتین کو یکجا کر کے ظالموں کے خلاف مزاحمتی جنگ لڑیں گے۔ حیدرآباد کی سول سوسائٹی کی جانب سے ضلع خیرپور میرس کے تعلقہ کوٹ ڈیجی میں اغواء کے بعد معصوم لڑکی رمشا وسان کے قتل کے خلاف مختیار عباسی، پروفیسر مشتاق مہرانی، پروفیسر امداد چانڈیو اور دیگر کی قیادت میں حیدرآباد پریس کلب کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ اس موقع پر مذکورہ رہنماؤں نے کہا کہ دس روز قبل کوٹ ڈیجی میں تیرہ سالہ رمشا کو ملزمان نے گھر سے اغوا کرنے کے بعد نو گولیاں مار کر قتل کر دیا اس طرح کے واقعات سندھ میں قانون کی حکمرانی کمزور ہونے کا ثبوت ہیں۔ واقعہ میں ملوث ملزمان کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جائے اور مقتولہ کے ورثاء کو انصاف فراہم کیا جائے۔ دوسری جانب ملزم کے خلاف اغواء برائے تاوان اور تین افراد کے قتل سمیت 25 مقدمات درج ہیں۔ وزیر اعلیٰ سندھ کے دباؤ پر تیرہ سالہ رمشا کو غیرت کے نام پر قتل کیس میں عبدالغفار وسان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ایس ایس پی خیرپور عمر طفیل کے مطابق ملزم کی شناخت مقتول رمشا کی والدہ نے کی۔ متعدد مقدمات میں مطلوب ملزم ذوالفقار بھی اس واقعے میں ملوث ہے جس کی تاحال گرفتاری عمل میں نہیں آ سکی۔ (لالہ عبدالحلیم)

سندھ کے لیے انسانی حقوق پر مبنی ثقافتی منصوبہ: لسانی اور مذہبی اقلیتیں

مذہبی اقلیتوں کے مسائل: خواتین کا مذہب جبری تبدیل کرانا

> کم سن بچوں کے لیے مذہب کی جبری تبدیلی کا خطرہ خواتین کی نسبت کہیں زیادہ شدید ہے۔ مذہب کی جبری تبدیلی کو پسند کی شادی کی ذاتی خواہش سے جوڑ کر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے مقدمات میں رضامندی کا معاملہ مشکوک ہے کیوں کہ جیسے ہی کوئی کم سن بچی اسلام قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کرتی ہے تو کوئی نہ کوئی مذہبی عالم فوراً نکاح پڑھانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ سولہ سال سے کم عمر بچیوں کا جنہیں باآسانی ورغلایا جاسکتا ہے، نیا مذہب قبول کرنا شک وشبے کا باعث ہے۔

سندھ میں مذہبی اقلیتوں کے خلاف جرائم میں قابل ذکر اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ عورت ہونے کے ناطے پہلے سے عدم تحفظ کی شکار ان خواتین کو مذہبی اقلیت ہونے کا اضافی 'کلنک' بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ عوامل امتیازی سلوک کی متعدد صورتوں میں اضافے کی وجہ بنتے ہیں۔ انہیں ایک ایسے سماجی نظام سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے جو بطور شہری ان کے بنیادی حقوق سلب کیے ہوئے ہے۔

مجموعی طور پر مذہب کی جبری تبدیلی سے متعلق تعمیری مکالمے کا فقدان ہے، خاص کر ہندو اور مسیحی برادریوں میں۔ اور جیسا کہ ایک مندوب نے نشاندہی کی کہ فوجداری قانون (برائے اقلیتی تحفظ) بل جیسے قوانین منظور کرنے میں ہچکچاہٹ سے صورت حال مزید خراب ہوئی ہے۔ درحقیقت قومی سطح پر مذہب کی جبری تبدیلی سے تحفظ کے لیے کوئی قانون موجود نہیں۔

مذہب کی جبری تبدیلی کے واقعات سے متعلق اعداد وشمار کا بنیادی ماخذ ذرائع ابلاغ ہیں۔ اس حوالے سے اعداد وشمار مقامی اخبارات میں چھپنے والی خبروں سے اخذ کیے گئے ہیں، کیوں کہ حکام کو ایسے واقعات کی شکایت خال خال ہی درج کرائی جاتی ہے۔

ملک بھر میں ہر سال مسلم مردوں کے ساتھ زبردستی شادی کے لیے، اندازاً ایک ہزار غیر مسلم لڑکیوں کا مذہب جبراً تبدیل کرایا جاتا ہے۔

پاکستانی قانون کے تحت مذہب کی تبدیلی تبھی "جبراً" قرار دی جاتی ہے جب ایسا "تشدد یا ڈرا دھمکا" کر کیا جائے۔ اس کے باوجود مذہبی اقلیتوں بالخصوص کم آمدن والے گھرانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے اغوا کی خبریں روزانہ کی بنیاد پر سامنے آتی ہیں۔ عموماً ہندو اور مسیحی لڑکیوں کو اغوا کے بعد جبراً مذہب تبدیل کرنے اور اغوا کاروں سے شادی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ حکام کی جانب سے مذہب کی جبری تبدیلی کی روک تھام کے لیے شاذ و نادر ہی اقدامات کیے جاتے ہیں۔

کم سن بچوں کا مذہب جبراً تبدیل کرانا

مشاورت کے بعد متعدد شرکاء نے اس بات سے اتفاق کیا کہ خواتین کا مذہب جبراً تبدیل کرانے کے لیے انہیں اغوا کیا جاتا ہے۔ شرکاء کے مطابق پولیس ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کرتی ہے کیوں کہ سرکاری موقف کے مطابق چونکہ 'مذہب تبدیل ہو چکا ہے' اس لیے کوئی جرم وقوع پذیر نہیں ہوا۔ جبری تبدیلی کے مقدمات لڑنے والے وکلاء کو بااثر گروہوں کی جانب سے مقدمہ کی پیروی چھوڑنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔

کم سن بچوں کے لیے مذہب کی جبری تبدیلی کا خطرہ خواتین کی نسبت کہیں زیادہ شدید ہے۔ مذہب کی جبری تبدیلی کو پسند کی شادی کی ذاتی خواہش سے جوڑ کر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے مقدمات میں رضامندی کا معاملہ مشکوک ہے کیوں کہ جیسے ہی کوئی کم سن بچی اسلام قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کرتی ہے تو کوئی نہ کوئی مذہبی عالم فوراً نکاح پڑھانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ سولہ سال سے کم عمر بچیوں کا جنہیں باآسانی ورغلایا جاسکتا ہے، نیا مذہب قبول کرنا شک وشبے کا باعث ہے۔

مذہب کی جبری تبدیلی کے واقعات میں) پولیس اغواء کی ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کرتی ہے کیوں کہ سرکاری موقف کے مطابق چونکہ 'مذہب تبدیل ہو چکا ہے' اس لیے کوئی جرم وقوع پذیر نہیں ہوا۔

مذہب کی جبری تبدیلی پر قانون سازی

حال ہی میں ہندو اور سکھ مذہبی قوانین (بشمول عائلی امور) کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے بالترتیب قومی اور صوبائی سطح پر قانون سازی کی گئی ہے۔ نومبر 2016 میں سندھ اسمبلی نے جبراً مذہب تبدیل کرانے کی روک تھام کا بل منظور کیا۔ اگرچہ اس بل کو تمام اہم سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل تھی، پھر بھی سخت گیر مذہبی حلقے اسے قانون بننے سے روکنے میں کامیاب رہے۔

متعدد شرکاء کے خیال میں ہندو میرج ایکٹ 2017 کے بعض حصے بھی نافذ نہیں کیے جاسکے۔ اگرچہ اس قانون کی منظوری کے لیے بڑے پیمانے پر کوششیں کی گئی تھیں، تاہم اس قانون کے تحت تاحال قواعد وضع نہیں کیے جاسکے۔ اس قانون سے متعلق مباحثوں میں لڑکیوں کے لیے شادی کی کم سے کم عمر 18 برس مقرر کرنے کی حمایت کی گئی تھی۔ قانون کے مسودے پر اعتراض کرنے والے حلقوں نے پنجاب میں شادی کی کم سے کم عمر 16 برس ہونے کے پیش نظر اس قانون میں بھی شادی کے لیے کم سے کم عمر 16 سال مقرر کرنے کی تجویز دی۔

سفارشات

☆ مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی خواتین اور لڑکیوں کے اغوا کے واقعات خاص کر جہاں جبراً تبدیلی مذہب یا شادی کا شائبہ موجود ہو، سے متعلق اعداد وشمار بہتر انداز میں اکٹھے کیے جانے کی ضرورت ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ایسے واقعات سے متعلق اعداد وشمار ضلع وار اور سماجی و معاشی حالات کے کوائف کی بنیاد پر اکٹھے کیے جائیں۔

☆ موجودہ حکومت نے جولائی میں اپنی انتخابی مہم کے دوران اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ اور بطور شہری ان کے ساتھ مساوی برتاؤ یقینی بنانے کا دعویٰ کیا تھا۔ پریشر گروپوں کو حکومت پر اپنے وعدے پورے کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا چاہیئے۔

☆ مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے نمایاں پالیسیاں اپنانے کی ضرورت ہے۔

☆ مذہب کی جبری تبدیلی سے متعلق زیرالتواء بل کو قانون بنایا جائے۔

☆ جنسی ہراسانی کے واقعات کی نگرانی اور تفتیش کے لیے بنائی گئی سرکاری کمیٹیوں کی طرز پر، جبراً مذہب تبدیل کرانے کے واقعات کی نگرانی اور ان سے متعلق اعداد وشمار اکٹھے کرنے کے لیے بھی کمیٹیاں قائم کی جائیں۔

☆ 18 برس سے کم عمر بچی اگر نیا مذہب اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کرے تو مذہب تبدیل کرنے سے قبل

اسے غور وفکر کے لیے کم از کم چھ ماہ دیئے جائیں۔

☆ صرف 18 سال سے زائد عمر کی لڑکیوں کو مذہب تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے۔

☆ معاشرے میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی خصوصی ضروریات سے متعلق قبولیت کو عام کیا جائے۔

☆ سکول اور کالج میں غیر مسلم طلبہ کو اسلامی علوم پڑھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

☆ ذرائع ابلاغ پاکستان میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے مسائل پر مستند رپورٹنگ کریں۔

☆ اسی طرح پولیس اور عدلیہ کو مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے خلاف کارفرما حالات سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے، تاکہ ان اقلیتوں کیساتھ قانون کے مطابق مساوی سلوک یقینی بنایا جاسکے۔

لسانی اقلیتیں: شناخت کا سوال

پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور تجارتی مرکز کراچی، ملک کے کسی بھی دوسرے شہر کی نسبت زیادہ لسانی اقلیتوں کا گھر ہے، جن میں افغان، بنگالی، بہاری، برمی، شیدی اور ایرانی اقلیتی برادریوں سمیت کئی دیگر گروہ شامل ہیں۔ کئی اقلیتی برادریاں اپنے تئیں، نقل مکانی کا مشکل فیصلہ کر چکی ہیں تاہم کئی اقلیتی گروہ نہ صرف قانون نافذ کرنے والے اداروں، بلکہ سیاسی اور معاشی طور پر نسبتاً طاقتور دیگر لسانی گروہوں کے ہاتھوں بھی مسلسل ہراسانی، استحصال اور تشدد کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ کراچی میں منعقدہ مشاورتی نشست میں بنگالی اور افغان اقلیتوں کے مسائل پر نظر ڈالی گئی۔

ہم نے 2018 کی حالیہ مردم شماری میں لسانی اقلیتوں کو شامل نہ کرکے بہت بڑا موقع ضائع کیا

تقسیم کے بعد 70 کی دہائی میں افغانستان میں سوویت مداخلت کے بعد مہاجرین کی دوسری لہر اس وقت آئی جب پاکستان نے سرحد پار سے آنے والے مہاجرین کے لیے اپنی سرحدیں کھولیں۔ اگرچہ افغان باشندوں کے رہنے کے لیے علاقے مخصوص کیے گئے تھے تاہم انہیں وہ تمام سہولیات اور مراعات جو قانوناً ایک شہری کو حاصل ہیں، اور جو پناہ کے متلاشی افراد کو انسانی حقوق کے عالمی منشور کے تحت "ناقابل تنسیخ حقوق" کے طور پر حاصل ہیں، فراہم نہیں کی گئیں۔

مسئلے کی نشاندہی

جب کبھی بھی لسانی برادریاں نقل مکانی پر مجبور ہوتی ہیں، تو اکثر ان علاقوں کے مکین (ایسی مہاجرت کو) "سکڑتے" مواقع سے تعبیر کرتے ہوئے انہیں خطرہ سمجھتے ہیں۔ دنیا بھر میں ترقی پسند اقدار جیسے تکثیریت اور دیگر ثقافتوں اور قومیتوں کو فطری انداز میں جذب کرنے کا عمل روبہ زوال ہے، اور مہاجرت کو قابو میں لانے اور مذہبی شناختوں کو مضبوط کرنے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے۔ مثلاً پاکستان میں عارضی قانونی حیثیت کے حامل ہونے کے باعث بنگالی افراد شدید عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ بنگالی برادری کے ایک مندوب کا کہنا تھا کہ افغان جنہیں ابتدا ریاست کی جانب سے خوش آمدید کہا گیا تھا، کے برعکس بنگالی ہمیشہ سے بے اعتنائی کا شکار رہے ہیں۔

ہم نے لوگوں کو سیاسی وابستگی کی بناء پر کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ حاصل کرتے دیکھا ہے۔ کیا ضروری دستاویزات حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ اگر کوئی شناختی کارڈ حاصل کرنا چاہے تو اسے ستر ہزار روپے جبکہ انٹرمیڈیٹ سرٹیفکیٹ کے حصول کے لیے چالیس ہزار روپے دینا پڑتے ہیں۔

گویا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وسائل کے حامل افراد کے لیے رجسٹریشن اور اس کے جملہ فوائد کا حصول ممکن ہے۔ بدقسمتی سے لسانی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے عالمی اور ملکی قوانین سے متعلق آگہی نہ ہونے کے برابر ہے۔

لیکن اگر کسی کے پاس وسائل نہ ہوں تو؟ ہمارے (بنگالی) بزرگ یہاں دفن ہیں اور ہمارے بچے یہاں پیدا ہوئے ہیں، لیکن اب بھی ہمیں اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے بھاری رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔

تقسیم کے بعد 70 کی دہائی میں افغانستان میں سوویت مداخلت کے بعد مہاجرین کی دوسری لہر اس وقت آئی جب پاکستان نے سرحد پار سے آنے والے مہاجرین کے لیے اپنی سرحدیں کھول دیں۔ اگرچہ افغان باشندوں کے رہنے کے لیے علاقے مخصوص کیے گئے تھے تاہم انہیں وہ تمام سہولیات اور مراعات جو قانوناً ایک شہری کو حاصل ہیں، اور جو پناہ کے متلاشی افراد کو انسانی حقوق کے عالمی منشور کے تحت "ناقابل تنسیخ حقوق" کے طور پر حاصل ہیں، فراہم نہیں کی گئیں۔ جیسا کہ ایک مندوب نے نشاندہی کی، کسی بھی افغان عسکریت پسند گروہ کی جانب سے دہشت گردانہ حملے کے بعد پوری برادری کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، جس سے اس مسئلے کی پیچیدگی میں اضافہ ہوا ہے۔

دسمبر 2014 میں آرمی پبلک سکول پر اندوہناک حملے کے بعد سے سخت اقدامات اٹھائے گئے ہیں اور (افغان باشندوں) کے رجسٹریشن کارڈوں (پی او آر) پر شک کیا جانے لگا ہے۔ متعدد مواقع پر پکڑ دھکڑ کے دوران پولیس نے افغان باشندوں کے پی او آر پھاڑ دیئے، جبکہ کئی افغان باشندے گرفتاری کے خوف سے کیمپوں میں مقیم ہیں۔

سفارشات

☆ ریاست کو کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈوں کے بغیر رہائش پذیر پناہ گزینوں کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیئے۔ ریاست کو وطن واپسی کے خواہش مند پناہ گزینوں کے مسائل سننے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے فعال کردار ادا کرنا چاہیئے۔

☆ لسانی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے ضامن عالمی اور ملکی قوانین سے متعلق آگاہی بڑھانے کی ضرورت ہے۔

☆ ملکی معیشت میں حصہ ڈالنے والی لسانی اقلیتیں شہریت کی مستحق ہیں۔

☆ ریاست کو تمام لسانی اقلیتوں کے حوالے سے منظم اور مستند کوائف اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے، بشمول ایک ٹھوس تحقیق جس سے واضح تصویر کشی ہوسکے تاکہ لسانی اقلیتوں کے حق میں پالیسی تشکیل دی جاسکے۔

☆ ریاست کو سی ایس آئی سیز اور پی او آر کارڈز کے مستحقین کے حوالے سے ایک واضح معیار طے کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ پاکستان میں مقیم لسانی اقلیتوں کے ہاں پیدا ہونے والے تمام بچے سی این آئی سیز کے حصول کے مستحق قرار دیے جائیں۔

(ایچ آر سی پی کی رپورٹ "بامعنی جمہوریت: خواتین اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کو قومی دھارے میں لانا" سے اقتباس)

اقلیتوں کا طویل انتظار

آئی۔اے۔رحمان

خوش قسمتی سے،اقلیتوں کی حالت زار کا اندازہ لگانے کے لیے کسی طویل تحقیق کی ضرورت نہیں؛ ان کی حالت بدلنے کے لیے جو کچھ درکار ہے وہ پہلے سے عیاں ہے۔ پاکستان کی اقلیتیں کئی سالوں سے پاکستان کے سابق چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی کے جون 2014ء کے فیصلے پر عملدرآمد کا مطالبہ کررہی ہیں۔

اس فیصلے میں، اعلیٰ عدلیہ نے آٹھ ہدایات جاری کیں جن میں (i) مذہبی رواداری کے فروغ کے لیے حکمت عملی تشکیل دینے کے لیے ایک ٹاسک فورس قائم کرنے (ii) مذہبی اور سماجی رواداری میں اضافے کے لیے نصابی اصلاحات؛ (iii) میڈیا میں نفرت انگیز تقریر کی حوصلہ شکنی کے لیے اقدامات اور مجرموں کے خلاف کارروائی؛ (iv) اقلیتوں کے لیے ایک قومی کونسل کے قیام؛ (v) اقلیتوں کی عبادت گاہوں کے تحفظ کے حوالے سے ایک اسپیشل پولیس فورس کی تربیت؛ (vi) اقلیتوں کے لیے پانچ فیصد ملازمتی کوٹہ پر عمل درآمد؛ (vii) ہدایات کی تعمیل کو یقینی بنانے اور اقلیتوں کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کی شکایات کے حل کے لیے سپریم کورٹ کے ایک تین رکنی بنچ کے قیام پر زور دیا گیا تھا۔

ان میں سے کچھ (جیسے کہ مذہبی رواداری کے حوالے سے ایک ٹاسک فورس کا قیام، ملازمتی کوٹہ پر عمل درآمد، اور حقوق کی خلاف ورزی اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی) پر فی الفور عمل درآمد کیا جاسکتا تھا، جبکہ نصابی اصلاحات اور ایک اسپیشل پولیس فورس کی تربیت کے لیے وقت درکار تھا۔ سپریم کورٹ کے ایک خصوصی بنچ نے فیصلے کے فوراً بعد کام شروع کردیا اور اس نے حکومت سے کئی مرتبہ رپورٹس طلب کیں، لیکن شاید کام کے بوجھ کی وجہ سے اس کے کام کی رفتار متاثر ہوئی۔ عدالتی احکامات پر عمل درآمد میں حکومتی ناکامی سے مذہبی برادریوں میں مایوسی پیدا ہوئی۔

عدالتی احکامات پر عمل درآمد کا فریضہ سپریم کورٹ کے ایک بنچ کو سونپا گیا تھا جو اس فیصلے کے نمایاں پہلوؤں میں سے ایک ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسے مذہبی اقلیتوں نے، کم از کم وقتی طور پر، اپنے حقوق کے میثاق کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ سول سوسائٹی کی تین تنظیموں نے انتظامیہ کی مسلسل سست روی سے تنگ آکر گزشتہ سال سپریم کورٹ سے رجوع کیا تاکہ حکومت کو اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی پر آمادہ کیا جاسکے، اور چیف جسٹس آف پاکستان نے ڈاکٹر شعیب سڈل کا ایک رکنی کمیشن کے طور پر تقرر کیا تاکہ وہ عمل درآمد کے حوالے سے ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کریں۔ کمیشن کا کام سہولیات کی کمی کی وجہ سے تعطل کا شکار ہے۔ اس ہفتے منگل کو، سپریم کورٹ نے اعلان کیا کہ یہ جلد ہی ایک حکم جاری کرے گی اور امید ہے کہ اس پر فی الفور عمل درآمد ہوگا۔

ایک بشپ کی گواہی

دریں اثنا، پاکستان میں اقلیتوں کے جائز مقام سے لاہور کے بشپ امریطس ڈاکٹر الیگزینڈر جان ملک نے اپنی حالیہ کتاب 'میرا پاکستان: ایک بشپ کی کہانی' میں ماہرانہ انداز سے گفتگو کی ہے۔

> سپریم کورٹ کے ایک خصوصی بنچ نے فیصلے کے فوراً بعد کام شروع کردیا اور اس نے حکومت سے کئی مرتبہ رپورٹس طلب کیں، لیکن شاید کام کے بوجھ کی وجہ سے اس کے کام کی رفتار متاثر ہوئی۔ عدالتی احکامات پر عمل درآمد میں حکومتی ناکامی سے مذہبی برادریوں میں مایوسی پیدا ہوئی۔

مصنف نے 'میرا پاکستان' کے الفاظ استعمال کیے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی مرضی سے اس ملک میں رہنے کا انتخاب کیا ہے۔ انہوں نے 1972 میں، کینیڈا میں اپنی پی ایچ ڈی کی تعلیم ترک کردی کیونکہ گرجا نے ان سے پاکستان واپس آنے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے کینیڈا میں ٹھہرنے کے حوالے سے خاندانی دباؤ کا یہ کہتے ہوئے مقابلہ کیا کہ: ''پاکستان میرا ملک ہے۔ مجھے اپنے آقا اور پاکستان کے لیے وہاں جانا ہوگا۔''

اس سوانح حیات میں، انہوں نے محض چند صفحات اپنی داستان حیات، 1980ء میں لاہور میں بطور بشپ اپنے انتخاب، جب وہ چند دن بعد اپنی انتالیسویں سالگرہ منانے والے تھے، اور اس عہدے پر اپنی 32 سالہ زندگی کے لیے وقف کیے ہیں۔ کتاب کے بقیہ حصے میں انہوں نے بتایا ہے کہ پاکستان کی اقلیتوں نے اپنے ملک کے لیے کیا کیا ہے؛ اور انہیں قائداعظم کی جانب سے طے کیے گئے ریاست کے نصب العین سے انحراف کے باعث کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

قیام پاکستان میں مسیحی برادری کے کردار کو بیان کرتے ہوئے وہ خود کو مسیحوں کی جانب سے پنجاب کی پاکستان میں شمولیت کے حق میں ووٹ دیے جانے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ وہ مختلف لکھاریوں کی جانب سے جمع کیے گئے شواہد پیش کرتے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ 1920ء اور 1930ء کی دہائی کے دوران کس طرح مسیحی برادری نے پنجاب کے مسلمانوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا، پنجاب کی تقسیم کی مخالفت کی اور باؤنڈری کمیشن سے استدعا کی کہ ان کی گنتی مسلمانوں کے ساتھ کی جائے۔

پھر وہ تعلیم اور دفاع کے شعبوں میں مسیحی برادری کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں، اور دعویٰ کرتے ہیں کہ: "حسب تناسب، دفاع پاکستان میں مسیحی شہداء کی تعداد دیگر تمام لوگوں سے زیادہ ہے۔" اقلیتوں کی جانب سے پیش کی گئیں خدمات کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ: "پاکستان کی 70 سالہ تاریخ میں، خاص طور پر ضیاء دور میں، آئین میں اسلامی شقوں کی شمولیت کے باعث اقلیتوں کی بطور شہری حیثیت قائداعظم کے پیش کردہ تصور سے یکسر تبدیل ہوگئی ہے۔" آئین میں، تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک، اور توہین مذہب کے قانون کے باعث پیش آنے والے مصائب کا حوالہ دیتے ہوئے، مصنف 1997ء سے 2012ء کے دوران اقلیتوں کے خلاف تشدد کا مفصل ذکر کرتے ہیں۔

بشپ ملک کہتے ہیں کہ اقلیتوں کے حقوق میں تخفیف کے باوجود، ''ملک کے لیے ان کی محبت اور اس کی خدمت کرنے کے عزم میں کسی بھی طور سے کمی نہیں آئی''۔ وہ معیشت اور ثقافت میں پارسی برادری کے کردار، اور تعلیم، صحت اور دفاع کے شعبوں میں مسیحی برادری کے کردار کا تذکرہ کرتے ہیں۔

بشپ کے لیے اپنے آقا کے لیے اپنی خدمات اور اپنے پاکستان کی خدمت کرنے کے عزم کے درمیان تصادم سے بچنا آسان نہیں تھا۔ جب 2001ء میں، بہاولپور کے ایک گرجا میں درجنوں عبادت گزاروں کو بے دردی سے قتل کردیا گیا تو انہوں نے ریاست یا لوگوں کو اس ظلم کا ذمہ دار ٹھہرانے کی بجائے مسیحی زندگیوں کے ضیاع کو مذہب کے لیے ان کی قربانی قرار دیا۔ اسلام آباد میں سینٹ تھامس چرچ اور مری میں سینٹ ڈینیز ہائی اسکول کی تعمیر 'اسے دو مرتبہ جلائے جانے کے بعد کے حوالے' سے ان کے اقدامات انتہا پسندوں کی جانب سے تباہ ہونے والے لڑکیوں کے اسکولوں کی فوری تعمیر نو میں ہماری ناکامی کے متضاد ہیں۔ اس میں ان مسلمان پاکستانیوں کے لیے ایک سبق ہے جنہیں اپنے عقیدے سے متعلق فرائض اور ریاست کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔

بشپ ملک کی پاکستان کی مذہبی اقلیتی برادریوں کے بنیادی حقوق تسلیم کرنے کی استدعا قابل احترام ہے کیونکہ ان کا لہجہ مناسب، غیر جانبدارانہ اور اعتدال پسند ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ بشکریہ ڈان)

معذوری کا شکار افراد کے حقوق

معذوری کا شکار افراد کے کنونشن کے تحت فراہم کردہ بعض حقوق

معذوری کا شکار افراد کے حقوق کا عالمی منشور 13 دسمبر 2006 کو منظور ہوا تھا۔ پاکستان نے 5 جولائی 2011 میں اس کی توثیق کی تھی

آرٹیکل **5**: برابری اور غیر امتیازی سلوک

معذوری کا شکار افراد کو کسی بھی بنیاد پر ہونے والے امتیازی سلوک سے موثر قانونی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

آرٹیکل **6**: معذوری کا شکار خواتین

ریاست کو اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ معذوری کا شکار خواتین اپنے بنیادی حقوق سے مکمل طور پر لطف اندوز ہوسکیں۔

آرٹیکل **7**: معذوری کا شکار بچے

ریاست کو اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ معذوری کا شکار بچے اپنے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں سے دوسرے بچوں کے ساتھ مساوی بنیادوں پر لطف اندوز ہوسکیں۔

آرٹیکل **13**: انصاف تک رسائی

معذوری کا شکار افراد کی انصاف تک موثر رسائی کو یقینی بنانے کے لیے، فریق ریاستیں انصاف کے انتظام وانصرام کے شعبے میں کام کرنے والے تمام افراد، بشمول پولیس اور جیل کے عملے کے لیے مناسب تربیت کا انتظام کریں گی۔

آرٹیکل **16**: استحصال، تشدد اور بدسلوکی سے تحفظ

فریق ریاستیں معذوری کا شکار افراد کو گھر کے اندر اور باہر ہر قسم کے استحصال، تشدد اور بدسلوکی سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے قانون سازی سمیت تمام انتظامی، سماجی، تعلیمی اور دیگر اقدامات کریں گی۔

آرٹیکل **21**: اظہار رائے کی آزادی اور معلومات تک رسائی

فریق ریاستیں اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تمام مناسب اقدامات کریں گی کہ معذوری کا شکار افراد اپنے اظہار رائے کی آزادی کے حق کا دیگر افراد کی طرح مساوی بنیادوں پر اور اپنی پسند کے تمام ذرائع مواصلات کے ذریعے استعمال کرسکیں۔

آرٹیکل **24**: تعلیم

معذوری کا شکار افراد کو تعلیم کا حق حاصل ہے اور فریق ریاستیں ہر سطح پر ایک جامع تعلیمی نظام اور تاحیات سیکھنے کے عمل کو یقینی بنائیں گی۔

آرٹیکل **25**: صحت

معذوری کا شکار افراد کو اسی درجیاور معیار کی مفت یا کم خرچ نگہداشت صحت کی سہولیات فراہم کی جائیں جو دیگر افراد کو فراہم کی جاتی ہیں، بشمول جنسی اور تولیدی صحت اور آبادی پر مبنی عوامی صحت کے پروگراموں میں۔

آرٹیکل **27**: کام اور ملازمت

ملازمت کی تمام اقسام سے متعلقہ تمام معاملات، بشمول بھرتی اور ملازمت کی شرائط، ملازمت کے تسلسل، کیریئر کی ترقی اور کام کے محفوظ اور صحت مند حالات کے حوالے سے معذوری کی بنیاد پر امتیازی سلوک کی ممانعت کی جائے۔

ملکی قانون کے تحت فراہم کردہ حقوق

تعلیم

معذوری کا شکار افراد کو:

- پاکستان بھر میں ڈائریکٹوریٹ جنرل سپیشل ایجوکیشن (DGSE) کی جانب سے قائم اسپیشل ایجوکیشن سنٹر میں مفت پرائمری تعلیم کی سہولت دی گئی ہے۔
- بصارت سے محروم طلبہ داخلہ فیس اور ٹیوشن فیس سے استثنا حاصل ہوگا
- معذوری کا شکار طلبہ کو انٹرمیڈیٹ کی سطح تک مفت تعلیم کی سہولت حاصل ہوگی

ملازمت

معذوری کا شکار افراد کے لیے ملازمتوں میں:

- تمام صوبوں میں ملازمتوں میں کوٹہ مخصوص کیا گیا ہے
- 15 سکیل اور سول عہدوں کے لیے ملازمتوں میں عمر کی حد میں دس سال کا اضافہ کیا گیا ہے
- سماعت بصارت اور جسمانی طور پر محروم افراد کو مقابلے کے امتحانات میں شرکت کی اجازت دی گئی ہے

سہولیات:

- معذوری کا شکار امیدواروں (سماعت، بصارت قوتِ گویائی اور جسمانی معذوری) کو مددگار یا آلے (رائٹر، کمپیوٹر، آڈیو ریکارڈ، بریل) درخواست پر فراہم کیے جائیں گے
- نابینا امیدواروں کو فی گھنٹہ پندرہ منٹ اضافی مہیا کیے جائیں گے
- ایسے تمام افراد جو کسی قسم کی معذوری کا شکار ہوں وہ محکمہ اطلاعات اور محکمہ ڈاک کے مقابلہ کے امتحانات میں حصہ لیسکتے ہیں۔ ان کے لیے اس محکمہ میں مخصوص فیصد کوٹہ مختص کیا گیا ہے
- فنی تربیت اور بحالی کی سہولتیں ویلڈنگ، بیچ فٹنگ (مشینسٹ) فٹنگ، ٹیلرنگ اور الیکٹریکل اور الیکٹرانک آلات کی تیاری کے لیے فراہم کی جائیں گی
- کمپیوٹر ٹریننگ کے سرکاری اداروں سے کمپیوٹر کی تربیت کی سہولتیں حاصل ہوں گی

صحت

معذوری کا شکار افراد کو

- وفاقی حکومت کے تمام ہسپتالوں میں مفت علاج کی سہولت حاصل ہے

نوٹ: متعلقہ درخواست فارم اور دیگر معلومات ڈپٹی سیکرٹری (درآمدات) وزارت تجارت حکومت پاکستان (اسلام آباد) سے حاصل کی جاسکتی ہیں

- ڈی ایچ اے اور سی ڈی اے کی جانب سے خریداری کے لیے پیش کی جانے والی زمین پر دو فیصد کوٹہ کی سہولت اور ابتدائی اور آخری ادائیگی پر پچاس فیصد کی رعایت حاصل ہوگی
- مکانات کی الاٹمنٹ میں معذوری کا شکار سرکاری ملازمین کو ترجیح دی جائے گی۔ (وفاقی حکومت کی ایمپلائز رہائشی اسکیموں میں کوٹہ مخصوص ہے)

مالی امداد

- ایسے خاندان جن میں دو یا دو سے زائد بچے معذور ہوں انہیں 25 ہزار روپے سالانہ دیے جائیں گے
- ایسے خاندان جن میں ایک بچہ معذور ہو، انہیں دس ہزار روپے سالانہ دیے جائیں گے۔ اس کے لیے درخواست فارم، شناختی کارڈ کی کاپی، تصویر جس میں اس شخص کی معذوری دکھائی دیتی ہو فراہم کرنا ہوں گے
- بےنظیر انکم سپورٹ پروگرام کے تحت ایک ہزار روپے ماہانہ فی خاندان کی امداد مہیا کی جائے گی مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ خاتون درخواست دہندہ شناختی کارڈ کی حامل ہوں اور ماہانہ گھریلو آمدنی 6000 روپے سے کم نہ ہو۔

آلات کی فراہمی

- امدادی اشیاء مثلاً وہیل چیئر، سفید چھڑی اور سماعت میں مدد دینے والے آلات، بیت المال کی جانب سے مفت فراہم کیے جائیں گے اس کے لیے وہی دستاویزات درکار ہوں گی جو مالی امداد کے لیے درخواست دیتے وقت فراہم کرنی ہوتی ہیں
- مصنوعی ٹانگیں اور مصنوعی دانت مفت دیے جائیں گے۔ ان کے لیے معذوری کے سرٹیفکیٹ فراہم کرنا ہوگا

متعلقہ ذمہ دار شعبے

تعلیم

ڈائریکٹر جنرل اسپیشل ایجوکیشن (DGSE)۔ ٹیلی فون: 30-9261929-051

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

فون: 5476665-051

وزارت تعلیم

فون: 9206338-051

ملازمت

نیشنل ٹریننگ سنٹر فوردی ڈش ایبل (NTCD)

فون: 9234224-051

صحت

وزارت صحت

فون: 9208048-051

کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) اسلام آباد ہاؤسنگ

فون: 282390-051

وزارت ہاؤسنگ اور تعمیرات

فون: 11-9245607-051

مالی امداد

پاکستان بیت المال

فون: 4-9250461-051

بےنظیر انکم سپورٹ پروگرام سیکرٹریٹ

فون: 11-9245607-051

قومی کمیشن برائے اقلیتی حقوق کا مسودہ قانون

عاصمہ جہانگیر کی پہلی برسی پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے ساتھیوں نے قومی کمیشن برائے اقلیتی حقوق کا مسودہ قانون منظور کرلیا ہے، جو ایک انتہائی اہم پیش رفت قرار دی جارہی ہے۔

11 فروری کو لاہور کے ایک مقامی ہوٹل میں انسانی حقوق کے لگ بھگ تین سو کے قریب کارکنوں، صحافیوں، دانشوروں، مزدور رہنماؤں، اراکین قومی وصوبائی اسمبلی اور وکلا کا اجتماع منعقد کیا گیا۔ یہ مرکز برائے سماجی انصاف اور عوامی کمیشن برائے اقلیتی حقوق کی جانب سے بلائی گئی ایک 'عوامی اسمبلی' تھی، جس نے طویل بحث ومباحثہ اور غور وفکر کے بعد قومی کمیشن برائے اقلیتی حقوق کے قانون کا مسودہ منظور کیا۔ یہ مسودہ اب منظوری کے لیے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں بھیجا جائے گا۔ یاد رہے کہ جسٹس تصدق حسین جیلانی کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ کے ایک تین رکنی بنچ نے اپنے 19 جون 2014 کے تاریخ ساز فیصلے میں یہ قومی کمیشن قائم کرنے کا حکم دیا تھا۔

22 ستمبر 2013 کو پشاور میں ایک گرجا گھر پر ہونے والے حملے میں ایک سو سے زائد مسیحی شہری ہلاک ہوئے۔ اس سانحے پر سپریم کورٹ کے اس وقت کے چیف جسٹس جسٹس تصدق حسین جیلانی نے جسٹس عظمت سعید اور جسٹس مشیر عالم کے ساتھ تین رکنی بینچ تشکیل دیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی اقلیتوں کے جان و مال اور حقوق و آزادیوں کے حوالے سے آئین کے آرٹیکل 20 کی روشنی میں جامع قانون سازی کی بنیادیں وضع کی جائیں اور حکومت و ریاست کو عملی اقدامات اٹھانے کا پابند بنایا جائے۔ عدالتی احکامات کے مطابق مذہبی رواداری کے فروغ کے لیے ایک خصوصی ٹاسک فورس تشکیل دی جائے، اس بات کی یقین دہانی کی جائے کہ اسکولوں کا نصاب منافرت کی بجائے مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دے، اقلیتوں کے تحفظ کے لیے قومی کونسل بنائی جائے جو مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے پالیسی سفارشات مرتب کرے، مذہبی اقلیتوں کے عبادت گاہوں کے تحفظ کے لیے خصوصی پولیس فورس تشکیل دی جائے، اس بات کی یقین دہانی کرائی جائے کہ ہر اس شخص کے خلاف فوری قانونی کارروائی کی جائے جو اقلیتی فرد یا افراد کے حقوق کی پامالی کا مرتکب ہوا ہو۔ سپریم کورٹ کا بینچ اس فیصلے پر عمل درآمد کو یقینی بنائے گا اور شکایات کی سماعت کرے گا۔

فیصلے کے مطابق، ''ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مذہبی اقلیتوں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنے والوں کے خلاف متعلقہ حکام نے فوری کارروائی کی ہوتی تو ایسے واقعات کا سدباب بہت عرصہ پہلے ہو چکا ہوتا۔'' عدالت کا یہ بھی کہنا تھا کہ 'اسکولوں اور کالجوں کی سطح پر ایسا نصاب لاگو کیا جائے جس سے مذہبی اور سماجی ہم آہنگی قائم ہو۔' مزید یہ کہ 'اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سب انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنے دلوں اور ضمیروں کو ٹٹولیں اور اپنے آپ سے سوال کریں کہ کیا ہم قائد اعظم کے تصور پاکستان اور آئین پاکستان میں دیے گئے اصولوں پر عمل پیرا ہوئے ہیں؟'

عوامی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے عوامی کمیشن برائے اقلیتی حقوق کے سرپرست اعلیٰ آئی اے رحمان کا کہنا تھا کہ قومی کمیشن برائے اقلیتی حقوق کے قیام کا فیصلہ لیاقت نہرو پیکٹ 1950 میں بھی کیا گیا تھا، سن 2014 کے عدالتی فیصلے میں بھی اور سن 2016 کے قومی ایکشن پلان میں بھی۔' سروپ اعجاز ایڈووکیٹ کا کہنا تھا کہ اس کمیشن کا قیام اقوام متحدہ کے پیرس اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے یعنی اسے سیاسی دباؤ سے تحفظ، مالیاتی خودمختاری اور قانونی تحفظ حاصل ہو۔

جسٹس ریٹائرڈ ناصرہ اقبال نے کہا کہ حکومت اور عوام کی حقیقی شراکت اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک مذہبی امتیاز کا مکمل خاتمہ نہ ہو۔ جسٹس ڈاکٹر خالد مسعود کے مطابق، ''حقوق اور مواقع کے حوالے سے موجود تمام تر امتیاز کا خاتمہ دراصل جمہوریت، تنوع اور مذہبی یگانگت پر مبنی معاشرہ کے قیام کے لیے انتہائی ضروری ہے۔'' ڈاکٹر کلیان سنگھ نے زور دیا کہ عدالتی فیصلے پر اس کی روح کے مطابق عمل ہونا چاہیے تاکہ پاکستان میں انسانی حقوق اور قانون کی عمل داری پر مبنی معاشرہ قائم ہو۔

وجاہت مسعود نے کہا کہ بالواسطہ اور بلاواسطہ امتیاز دراصل کمزور سماجی گروہوں کو معاشرے کے مرکزی دھارے سے کاٹ دیتا ہے لہذا انسانی اور شہری مساوات کے اصول کو ادارہ جاتی تحفظ دیا جانا ضروری ہے۔

بشپ جان الیگزینڈر ملک نے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اقلیتوں کے معاشی، سماجی اور ثقافتی امتیاز کا سدباب کیا جائے۔ صوبائی وزیر برائے انسانی حقوق، اعجاز عالم اگسٹین نے یقین دہانی کرائی کہ پاکستان تحریک انصاف کی حکومت قائد اعظم کے وژن پر حقیقی طور پر عمل درآمد کرتے ہوئے سن 2014 کے عدالتی فیصلے پر ایمان داری سے عمل کرنے کی بھرپور کوشش کرے گی۔

ڈی ڈبلیو سے بات کرتے ہوئے عوامی کمیشن برائے اقلیتی حقوق کے سربراہ پیٹر جیکب کا کہنا تھا کہ تمام سیاسی جماعتوں نے سن 2018 کے انتخابی منشوروں میں اس کمیشن کے قیام کا وعدہ کیا تھا، لہذا اب انہیں قانون سازی کی حمایت کرنا چاہیے۔ اس کمیشن کے پاس قوانین اور پالیسیوں پر عمل درآمد کی نگرانی کا اختیار ہونا چاہیے تاکہ وہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ اور نئے قوانین اور پالیسیوں کی تشکیل میں مثبت کردار ادا کرے۔

عوامی کمیشن کے بانی رکن پرکاش مہتانی ایڈووکیٹ نے ڈی ڈبلیو کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ سندھ کمیشن برائے اقلیتی حقوق کے قیام کا فیصلہ سن 2016 میں ہوا لیکن 'رولز آف بزنس' پر کام نہیں ہوا تو کمیشن بھی کھٹائی میں ہے۔ انصاف کی فراہمی میں تاخیر گویا انصاف کی فراہمی سے انکار ہے۔ اگر قائد اعظم کے وژن کی روشنی میں سن 2014 کے تاریخی فیصلے پر عمل کیا جائے تو پاکستانی اقلیتوں کے تمام مسائل حل ہوسکتے ہیں۔'

(بشکریہ: ڈی ڈبلیو)

اقلیتیں اور خوف کی زندگی

ثاقب اکبر

اخلاق اور قانون تو یہی کہتے ہیں کہ پاکستان میں اقلیتوں کو بلاخوف زندگی گزارنا چاہیے لیکن کیا ایسا ہی ہے، کیا پاکستان میں اقلیتیں بلاخوف زندگی گزار رہی ہیں؟ اس سوال کا جواب ہم میں سے ہر ایک کو معلوم ہے، یہ جواب جہاں لمحہ فکریہ ہے وہیں دردناک بھی۔ البتہ یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا سب مسلمان اس ملک میں بلاخوف زندگی بسر کر رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ دونوں سوالوں کا جواب ملتا جلتا ہی ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خوف کی یہ فضا ایک ہی طرز فکر نے مسلط کر رکھی ہے۔ اگر شدت پسند تنظیموں اور گروہوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کا فکری افق ایک سا ہی دکھائی دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ مختلف گروہوں کے نام مختلف ہوں تاہم طرز فکر اور شدت عمل ایک جیسا ہے۔ اقلیتوں پر خوف کے سائے کا معاملہ سماجی بھی ہے، مذہبی بھی اور انتظامی بھی۔ دہشت گردی کے خلاف قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کوششوں سے اس معاملے میں اگر ایک طرف بہتری آئی ہے تو دوسری طرف بعض مذہبی گروہوں کے متشددانہ طرز عمل میں اضافہ بھی دیکھنے میں آیا ہے بلکہ بعض ایسے گروہ منظر عام پر آئے ہیں جن کے بارے میں پہلے توقع نہیں کی جاتی تھی، انھوں نے مذہبی جنونیت کے مظاہرے سے بہت سے سماجی مفکرین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں ریاست کو دیگر گروہوں کی نسبت تیزی کے ساتھ متحرک ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اقلیتوں کے حوالے سے اس گروہ کی شدت پسندی کا دائرہ دیگر گروہوں کی نسبت وسیع تر اور شاید جذباتیت سے زیادہ معمور ہے۔ تاہم کہا جاسکتا ہے کہ قانون کی عمل داری میں تو بہتری آئی ہے لیکن مذہبی اور سماجی سطح پر ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے۔

پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان چاہتے ہیں کہ دنیا بھر میں جن ممالک میں مسلمان اقلیتیں بستی ہیں وہ محفوظ رہیں، اپنی مذہبی رسوم آزادی سے ادا کریں اور سماج اور حکومت کی سطح پر ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ ہو۔ بس اسی فکر کو اپنے ملک میں بسنے والی مذہبی اقلیتیوں کے لیے اپنانے کی ضرورت ہے۔ جو حقوق ہم غیر مسلم اکثریتی ممالک اور معاشروں میں مسلمانوں کے لیے چاہتے ہیں، وہی حقوق ہمیں اپنے ملک اور معاشرے میں غیر مسلموں کو دینا چاہئیں۔ ہم تو اس سے بھی بڑھ کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان تو اپنے نبی کریم کو رحمت اللعالمین مانتے ہیں، قرآن حکیم نے انھیں یہی لقب عطا کیا ہے تو پھر مسلمان کو پورے وجود سے پیغام رحمت ہونا چاہیے، مسلمان ممالک میں بھی اور غیر مسلم ممالک میں بھی۔ پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو اپنی تاریخ اور اپنے قائدین کا پاکستان کے لیے تاریخی موقف پیش نظر رکھنا چاہیے، جس کے مطابق پاکستان اسی لیے معرض وجود میں آیا کہ ہندو اکثریت کے ملک میں مسلمانوں کو برابر کے حقوق میسر نہ تھے یا مسلمان راہنماؤں کو یہ اندیشہ تھا کہ انھیں انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان میں دوسرے درجے کا شہری بنا دیا جائے گا۔ اگر یہ مقدمہ درست ہے تو پھر ہمیں پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری نہیں سمجھنا چاہیے؛ سماجی سطح پر بھی اور سرکاری سطح پر بھی۔ یہی وعدہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی 11 اگست 1947 کی تاریخی اور معرکت الآرا تقریر میں کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

آپ آزاد ہیں، آپ آزاد ہیں اپنے مندروں میں جانے کے لیے۔ آپ آزاد ہیں اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے اور ریاست پاکستان میں اپنی کسی بھی عبادت گاہ میں جانے کے لیے۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے ہو ریاست کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔

شاید قائد کے اسی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے پاکستان کے بزرگ قانون دان اور سابق وزیر قانون ایس ایم ظفر نے گذشتہ دنوں کہا ہے کہ دو قومی نظریہ پاکستان بنانے کے لیے تھا بعد کے لیے نہیں، اب سب پاکستانی برابر کے شہری ہیں اب ملک چلانے کے لیے ایک قومی نظریے کی ضرورت ہے۔ یہ بات انھوں لاہور میں 17 دسمبر 2018 کو ایک بشپ کی کتاب کی تقریب رونمائی سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق قائداعظم محمد علی جناح نے صرف 11 اگست کی تقریر ہی نہیں کی بلکہ لگ بھگ اپنی 33 تقاریر میں اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں بات کی۔ پاکستان کے آئین میں بھی لکھا ہے کہ دستور، قانون اور اخلاقیات کی رو سے ہر شہری کو اپنے مذہب کے اعلان، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کا حق حاصل ہے۔

یہ درست ہے کہ آئین و قانون میں اقلیتوں کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا گیا ہے لیکن ان کے بعض تحریری حقوق کی فراہمی کے لیے کوئی طریقہ کار موجود نہیں ہے، جس کے تحت ان کو دیے گئے تحریری حقوق کی عملی ضمانت فراہم ہو سکے۔ اس کی ایک سنگین مثال اقلیتوں کے لیے ملازمتوں کے کوٹے پر عمل درآمد کا مسئلہ ہے۔ ایک اور تجزیہ کار کے مطابق ملازمتوں کا کوٹا جو تشکیل پاکستان کے ابتدائی دنوں میں 11 فیصد تھا، اب کم ہو کر 5 فیصد رہ گیا ہے، اس پر بھی عمل درآمد کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قانون پر عمل درآمد کے لیے کوئی قانونی طریق کار موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 2017 کی ایک رپورٹ کے مطابق اس کوٹے پر تقریباً دو سے تین فیصد عمل کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ایک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جس قدر ملازمتیں اقلیتوں کو فراہم کی جاتی ہیں وہ بیشتر معاشرے میں پست درجے کی سمجھی جاتی ہیں۔ یہ کیا قیامت ہے کہ اقلیتوں کو بیشتر خاکروب کی ملازمت فراہم کی جائے اور اس سے بڑھ کر بھی قیامت یہ ہے کہ کوئی سیاسی پارٹی اپنے ورکروں کو خاکروب کی ملازمت مہیا کردے اور پھر وہ ملازمت پر حاضر ہونے کو اپنی کسر شان سمجھیں اور صرف تنخواہ لینے پر گزارہ کریں۔ کیا اعلیٰ درجے کی ملازمتیں مہیا کرنا اس کوٹے کے تقاضوں میں شامل نہیں۔ پاکستان کی تمام وزارتوں میں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کوٹے کی فراہمی یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔

یاد رہے کہ معاشرے کے اندر انسان دوستی کے جذبات کی پرورش ضروری ہے۔ محبت اور انسانیت کا ایک گراں قدر اور خوبصورت سرمایہ ہے۔ ہمارے وجود سے یہ بات ظاہر ہونی چاہیے کہ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ ہمیں غیر مسلموں سے اسلامی عقائد کے اظہار کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم رات دن جن عقائد کا اظہار کرتے ہیں ان میں سے بھی بہت سے غیر مسلموں کے عقائد سے متصادم ہوتے ہیں۔ عقائد کا اختلاف اور افکار کی رنگارنگی معاشروں میں ہمیشہ سے ہے اور تنگ نظری سے معاشرے تنزلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تنگ نظری ایک بیماری ہے جو قوموں کو اندر ہی اندر سے کھا جاتی ہے۔ اختلاف کو برداشت کرنا سیکھنا چاہیے۔ مسلمانوں کو خاص طور پر اپنے نبی کریمؐ کی پیروی کرتے ہوئے دوسروں کے لیے محبت و رافت کا نمونہ بننے کی ضرورت ہے۔ بعض احباب بعض آیات و روایات کے ظواہر سے یک پہلو استفادہ کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے، جن کے سینے پر ان ساری آیات کا نزول ہوا، غیر مسلموں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا۔ وہ رویہ ہی ان آیات کے صحیح مفہوم کا تعین کرسکتا ہے۔ جس دین کو ساری انسانیت تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اس کی پیامبری کے لیے ساری انسانیت کے لیے خیر کا جذبہ اپنے وجود میں پروان چڑھانا ضروری ہے۔

(بشکریہ تجزیات آن لائن)

جوتوں کی دکانوں پر کام کرنے والے لڑکوں کے حقوق سلب کئے جانے کا انکشاف

کمالیا محکمہ لیبر سے نوٹس لینے کا مطالبہ. تفصیلات کے مطابق کمالیہ شہر میں مختلف نجی کمپنیوں کی تقریبا تین درجن کے لگ بھگ شوز (جوتوں) کی دکانیں ہیں. جن پر پندرہ پندرہ سال کی عمر کے لڑکے روزانہ چودہ گھنٹے کام کرتے دیکھے جارہے ہیں۔ دوکان مالکان ان نوعمر لڑکوں سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں۔ یہی لڑکے صبح 9 بجے دوکان کھولتے ہیں۔ دکان کی صفائی ستھرائی کرتے ہیں اور سارا دن گاہکوں سے مغز ماری کرتے ہوئے رات 11 بجے تک کام کرتے ہیں اور دکان مالکان ان محنت کش بچوں کو ماہانہ 8 ہزار روپے اجرت دیتے ہیں۔ جو کہ ایک ظلم ہے جبکہ حکومت پنجاب نے ان محنت کش بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے باقاعدہ محکمہ لیبر قائم کر رکھا ہے محکمہ لیبر ٹوبہ کے حکام اس سنگین معاملے سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ کمالیہ کی شہری وسماجی تنظیموں نے کمشنر فیصل آباد ڈویژن سے مطالبہ کیا ہے کہ جوتوں کی دکانوں پر کام کرنے والے محنت کش لڑکوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے انہیں حکومت کے منظور شدہ اجرت ماہانہ پندرہ ہزار پانچ سو روپے دلوائے جانے کو یقینی بنایا جائے۔ (اعجاز اقبال)

نادرا سنٹر میں عملے کی تعیناتی کا مطالبہ

اوکاڑہ بصیر پور شہر کی آبادی ایک لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ بصیر پور شہر میں مقامی شہریوں کو شناختی کارڈ کے اجراء کے لیے محکمہ نادرا اور پاکستان پوسٹ آفس کے مشترکہ منصوبہ کے تحت مقامی پوسٹ آفس میں نادرا سنٹر قائم کیا گیا مگر اس پوسٹ آفس میں آپریٹر مہیا نہیں کیا گیا۔ مقامی پوسٹ آفس میں تعینات پوسٹ ماسٹر کو پوسٹ آفس اور نادرا سنٹر میں شناختی کارڈ بنانے کا دوہرا کام کرنا پڑتا ہے اس صورتحال کی وجہ سے پوسٹ آفس میں خواتین ومرد حضرات کی لمبی لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں اور شہریوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مقامی لوگوں نے مطالبہ کیا ہے کہ پوسٹ آفس بصیر پور میں قائم نادرا سنٹر کے لیے آپریٹر کی جلد از جلد تعیناتی کی منظوری دی جائے تاکہ مقامی شہریوں کی مشکلات کا ازالہ ممکن ہو سکے۔ (اصغر حسین حماد)

نوجوان پر پولیس تشدد کے خلاف احتجاجی مظاہرہ

بونیر 7 فروری 2019ء کو علاقہ چملہ کے مشران نے پولیس کے حوالات میں بند کر کے مقدمات درج کرنے کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا، احتجاج میں علاقہ ککے مشران سید معمر باچا، نصیب خان، جہانزیب خان، حکیم بہادر، جاوید خان، بخت بلند خان اور نائب ناظم اشتر خان سمیت کئی شخصیات شریک ہوئیں، اس موقع پر جاوید خان اور حکیم بہادر نے کہا کہ ناواگئی پولیس کے سادہ کپڑوں میں ملبوس اہلکاران شہاب اور انور نے اپنے گھر کے پاس زمینوں پر کام کرنے والے نوجوانوں کا پیچھا کیا اور انہیں زدوکوب کیا اور باوردی پولیس موبائل کو بلا کر تینوں نوجوانوں عمران بہادر، نعیم بہادر اور بہار علی کو پولیس سٹیشن منتقل کیا، جہاں ان کو تشدد کا نشانہ بنایا اور ان کے خلاف مقدمات درج کئے جبکہ گھر پر موجود ملک بہادر کو بھی مقدمہ میں ملوث کیا، علاقہ مشران نے واقعہ کی مذمت کی اور پرامن شہریوں پر پولیس گردی کی مذمت کی۔ عوامی ورکر پارٹی کے جہانزیب، نائب ناظم اشتر خان نے اپنے خطاب میں کہا ہے کہ کھیتوں میں کام کرنے والے جوانوں کے خلاف سادہ کپڑوں میں ملبوس اہلکاروں کا تعاقب، حجروں پر بغیر سرچ وارنٹ داخل ہونا اور گھروں میں بغیر لیڈی پولیس کے داخلہ کی کسی صورت اجازت نہیں دیں گے۔ ادھر ایس ڈی پی او نعیم خان، ایس ایچ او افسان خان نے میڈیا کو بتایا ہے کہ چھاپہ مخبری کی اطلاع پر مارا گیا تھا لیکن تینوں ملزمان نے پولیس کا راستہ روک کر ہاتھا پائی کی اور اصل ملزم ملک بہادر کو موقع سے فرار کرایا جس نے گھر پہنچ کر پولیس پر فائرنگ کی ہے اور ملزمان کے ہاتھوں سپاہی شہاب کو زخم بھی آئے ہیں۔ (نامہ نگار)

خواجہ سراؤں کا احتجاجی مظاہرہ

پشاور 4 فروری 2019ء کو شبانہ نامی خواجہ سراء کے قتل اور قاتل کی عدم گرفتاری کے خلاف پشاور پریس کلب کے سامنے پشاور سمیت دیگر اضلاع سے آئے ہوئے خواجہ سراؤں نے احتجاجی مظاہرہ کیا، مظاہرے کی قیادت خواجہ سراء آرزو، لیلیٰ خان اور دیگر کر رہے تھے۔ خواجہ سراؤں نے ہاتھوں میں پلے کارڈ اور بینر اٹھا رکھے تھے جن پر قاتل کی گرفتاری اور پھانسی کے سزا کے مطالبات درج تھے، اس موقع پر میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے خواجہ سراؤں کا کہنا تھا کہ صوبہ بھر میں آئے روز خواجہ سراؤں کو قتل کیا جارہا ہے جبکہ بعض علاقوں سے خواجہ سراؤں کو بے دخل کرنا بھی معمول بن چکا ہے جبکہ پولیس کی جانب سے تاحال شبانہ اور دیگر خواجہ سراؤں کے قتل میں ملوث ملزمان کو گرفتار نہیں کیا جاسکا، انہوں نے کہا کہ صوبہ خیبر پختونخوا میں خواجہ سراؤں کو سب سے زیادہ جان کا خطرہ ہے اور پولیس تعاون کرنے سے گریزاں ہے۔ ان کے ساتھی خواجہ سراء شبانہ کو بے دردی سے مارا گیا لیکن آج تک پولیس نے اس کے قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا بلکہ پولیس والے ایف آئی آر بھی درج کرنے کو تیار نہیں ہیں، انہوں نے وزیراعظم عمران خان، چیف جسٹس آف پاکستان، آئی جی پولیس اور دیگر سے مطالبہ کیا کہ ان کے کیلئے کوئی اقدام اٹھایا جائے اور شبانہ کے قاتل کو گرفتار کر کے قانون کے مطابق سزا دی جائے۔ (روزنامہ مشرق)

ہسپتال کی بجلی ایک ماہ سے بند

خیبر 24 فروری 2019ء کو تحصیل باڑہ ڈوگرہ ہسپتال میں پچھلے ایک ماہ سے بجلی بند ہے جس کے باعث مریضوں کو سخت مشکلات کا سامنا ہے، ایکسرے، الٹراساؤنڈ اور دیگر لیبارٹری ٹیسٹ کیلئے عوام کو دوسرے شہروں کو جانا پڑتا ہے، علاقے کے عوام نے میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ہسپتال میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ایکسرے، ٹیسٹ، الٹراساؤنڈ مشین اور دیگر مشینیں بند پڑی ہیں جس کی وجہ سے عوام کو سخت تکلیف کا سامنا ہے۔ ہسپتال میں ایکسرے نہ ہونے کی وجہ سے مریضوں کو باڑہ شہر اور دیگر شہروں کو جانا پڑتا ہے جس کے باعث ایک ایکسرے پر دوسو کے بجائے ہزار سے بھی زیادہ خرچہ آتا ہے (روزنامہ آج)

معذوری کے شکار افراد کا مظاہرہ

پشاور 18 فروری 2019ء کو معذوری کے شکار افراد نے حیات آباد پولیس کے نامناسب رویہ کے خلاف گورنر ہاؤس کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا جس کی قیادت صدر خیر زمان اور دیگر کر رہے تھے، مظاہرین نے ہاتھوں میں پلے کارڈ اور بینرز اٹھا رکھے تھے اور پولیس کے خلاف شدید نعرے درج تھے، انہوں نے کہا کہ ہم معذور افراد اپنے بچوں کیلئے مزدوری کر رہے ہیں اور موٹر سائیکلوں اور دیگر گاڑیوں میں کارخانوں مارکیٹ سے حاجی کیمپ اڈہ تک مختلف قسم کے کپڑے لاتے ہیں لیکن اس میں کوئی تخریب کاری کا مواد نہیں ہے۔ یہ کام صرف اپنے بچوں کیلئے ایک وقت کی روزی کمانے کیلئے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حیات آباد پولیس انہیں بے جا تنگ کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے بھتہ کا مطالبہ بھی کرتی ہیں، بھتہ نہ دینے کی صورت میں ان پر تشدد اور ظلم کرتی ہیں۔

(روزنامہ ایکسپریس)

پسند کی شادی کرنے والا تورغر کا جوڑا کراچی میں 'غیرت' کے نام پر قتل

کراچی 23 فروری 2019ء کو خیبر پختونخوا کے ضلع تورغر سے تعلق رکھنے والے نوجوان جوڑے کو کراچی میں 'غیرت' کے نام پر قتل کر دیا گیا۔ 4 روز قبل سرجانی تھانہ کی حدود حب ڈیم کے قریب سے ایک لڑکا اور لڑکی کی تشدد زدہ لاشیں برآمد ہوئیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ بات سامنے آئی کہ دونوں کو گلے پر وار کر کے قتل کیا گیا تھا، اب پولیس کی ابتدائی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کو غیرت کے نام پر قتل کیا گیا ہے۔ پولیس کے مطابق مقتول لڑکا نصیب زرخان اور لڑکی تورغر کے رہائشی تھے، دونوں نے بھاگ کر شادی کی تھی، دونوں کا آبائی تعلق خیبر پختونخوا کے علاقے کالا ڈھاکہ (تورغر) سے ہے، گزشتہ سال جولائی میں نصیب زرخان گھر سے جھگڑا کر کے چلا گیا تھا اور اگست میں لڑکی مسماۃ بی بی لاپتہ ہوگئی تھی جس پر دونوں کے اہلخانہ کو علم ہوگیا کہ انہوں نے بھاگ کر شادی کر لی ہے، اور پھر جرگہ بیٹھا جس میں مبینہ طور پر دونوں کو قتل کرنے کا فیصلہ ہوا، دونوں کے اہلخانہ نے مقتولین کی گمشدگی کا مقدمہ درج نہیں کروایا، لڑکی کے ورثاء گھر کو تالا لگا کر غائب ہیں، واقعے کا مقدمہ سرکار کی مدعیت میں درج کر لیا گیا ہے جس میں غیرت کے نام پر قتل سمیت دیگر دفعات شامل ہیں۔

(نامہ نگار)

ایڈیٹر کے نام خطوط

27 برسوں سے جیل میں بند قیدی انصاف کے منتظر

جھنگ 19 جولائی 1991ء کو سرور، خلیل اور شوکت علی کے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہوا۔ بعد میں انسداد دہشت گردی کی عدالت نے تینوں ملزموں کو سزائے موت اور دو کو سزائے موت کے ساتھ عمر قید کی سزا سنائی۔ ملزموں نے انسداد دہشت گردی عدالت کے فیصلے کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جو کہ خارج ہوگئی۔ جس پر سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ 28 جولائی 2005ء کو سپریم کورٹ کے جج افتخار محمد چوہدری، جسٹس ایم جاوید بٹر اور جسٹس سید سعید نے اپیل کی سماعت کی۔ مگر اس کے بعد سے اب تک اپیل سپریم کورٹ میں التواء کا شکار ہے۔ گزشتہ کئی برس گزر جانے کے باوجود اپیل کی سماعت نہیں کی جا رہی۔ ملزمان سرور، خلیل اور شوکت علی گزشتہ 27 برسوں سے جیل میں بند ہیں جس دوران ان کے کئی دوست اور عزیز و اقارب وفات پا چکے ہیں۔ سرور کے باپ، والدہ اور دونوں بھائی فوت ہو چکے ہیں اور وہ جیل میں بند ہونے کے باعث ان کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا۔ سرور کے گھر میں کوئی بھی مرد زندہ نہیں بچا جو اپنے عزیز کے مقدمے کی پیروری کر سکے اور اس کی بے گناہی ثابت کر سکے۔ گزشتہ 27 برسوں سے جیل میں مقید تینوں افراد کے اہل خانہ نے عدالت عظمیٰ سمیت کئی اعلیٰ اداروں سے اپیلیں کی ہیں کہ ان کے عزیزوں کے مقدمے کی سماعت کی جائے اور اس مقدمے کا تصفیہ کیا جائے مگر حکام نے اس مسئلے کا تا حال نوٹس نہیں لیا۔ جہد حق کی وساطت سے عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس سمیت دیگر اعلیٰ حکام سے استدعا ہے کہ مقدمے کی سماعت میں مزید تاخیر نہ کی جائے اور متاثرین کو فی الفور انصاف فراہم کیا جائے۔

ریحانہ بی بی (27 برس سے قید سرور کی ہمشیرہ)

جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر

ٹوبہ ٹیک سنگھ متعلقہ اداروں کی چشم پوشی کے نتیجہ میں ضلعی کمپلیکس میں واقع آفیسرز کالونی گندگی کے ڈھیر اور مویشوں کے باڑے میں تبدیل ہوگئی، ضلعی کمپلیکس سے ملحقہ جی او آرون میں مختلف سرکاری محکموں کے افسروں اور عدلیہ کے ججوں کی رہائش گاہیں ہیں، جہاں صفائی کا کوئی نظام موجود نہیں، گندگی کے ڈھیروں کے باعث تعفن پھیل رہا ہے، پانی کے جوہڑوں میں ڈینگی لاروے سمیت دیگر مچھروں کی بہتات ہے، جبکہ وبائی امراض پھیلنے سے مکین طرح طرح کی امراض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ متعلقہ حکام سے درخواست ہے کہ صفائی کا باقاعدہ انتظام کیا جائے، اور غفلت کا مظاہرہ کرنیوالے اہلکاروں کیخلاف کارروائی عمل میں لائی جائے۔

(اعجاز اقبال)

محکمہ صحت پنجاب کا جنسی امتیازی سلوک

لاہور 8 مارچ پوری دنیا میں خواتین کے حقوق اور خود مختاری کے بارے میں بات چیت کی جا رہی ہے جو کہ ایک اچھا قدم ہے۔ بہت سے لوگ اس کے حق میں بات کرتے ہیں جن میں سے ایک میں بھی ہوں۔ مگر جنسی مساوات کے جن اصولوں کی بنیاد پر ہم خواتین کے حقوق کی بات کرتے ہیں ان ہی اصولوں کی بنیاد پر ہمیں مردوں سے ہونے والے جنسی امتیاز کی بھی بات کرنی ہوگی۔ صوبہ پنجاب کے ہسپتالوں میں آپ کو بہت سی خواتین نرسز نظر آئیں گی لیکن آپ کو پنجاب کے کسی سرکاری ہسپتال میں مرد نرسز نظر نہیں آئیں گے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت پنجاب سرکاری ہسپتالوں میں مرد نرسز کو تعینات ہی نہیں کرتی۔ لہذا مرد نرسز کی اکثریت صرف نجی ہسپتالوں میں کام کرتی ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو سندھ، کے پی کے اور بلوچستان میں مرد نرسز کو سرکاری ہسپتالوں میں تعینات کیا جاتا ہے۔

سرکاری ملازمتوں کے لیے جب پنجاب میں ڈاکٹروں کی تعیناتیاں کی جاتی ہیں تو خاتون اور مرد ڈاکٹرز دونوں ہی کی تعیناتی کی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ تو جنسی توازن برقرار رکھا جاتا ہے مگر محکمہ صحت پنجاب مرد نرسز کو تعینات ہی نہیں کرتی ان کے ساتھ ناانصافی اور جنسی امتیازی سلوک کیوں؟ یہ عمل سراسر ناانصافی ہے اور یہ آئین پاکستان کے آرٹیکل 27، ''ملازمتوں میں امتیاز کے خلاف تحفظ'' اور یو ڈی ایچ آر کے آرٹیکل 2,1 اور 30 کی بھی سراسر کھلی خلاف ورزی ہے۔

(طارق نور)

☆ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات کی رپورٹ

1-وقوعہ کیا تھا:			
2-وقوعہ کب ہوا؟	سال	مہینہ	تاریخ
3-وقوعہ کہاں ہوا؟	گاؤں	محلّہ	
	ڈاک خانہ	تحصیل وضلع	
4- کیا وقوعہ کا مقامی رسم ورواج سے تعلق ہے	ہاں	نہیں	
5-وقوعہ کیسے ہوا؟ (مختصر تفصیل)			

6-وقوعہ کا ماضی کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق اور اس کی مختصر تفصیل

7-وقوعہ کا شکار ہونے والے کے کوائف	نام	ولد/زوجہ	پیشہ

8-وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے معاشی/سماجی حیثیت	بچہ/بچی	عورت/مرد	غریب/ان پڑھ	بوڑھا/بوڑھی	بیمار
	مخالف سیاسی کارکن	سماجی کارکن	اقلیتی فرقے کارکن	دیگر (تخصیص کریں)	

9-وقوعہ میں ملوث اشخاص کے کوائف:	نام	ولدیت/زوجیت	عہدہ	پیشہ
	1-			
	2-			
	3-			
10-وقوعہ کے ذمہ دار فرد/افراد کی معاشی/سماجی حیثیت		بڑا جاگیردار/زمیندار/بہت امیر آدمی	متوسط طبقے سے/غریب آدمی	بااثر صلاحیت/سیاسی اثر ورسوخ

11-وقوعہ کی پشت پناہی کرنے والے عناصر کے کوائف	نام اور ولدیت	عہدہ	پیشہ	پارٹی/ادارہ
	1-			
	2-			
	3-			

12-وقوعہ سے متعلقہ فریقین گواہان وغیر جانبدار افراد کے کوائف وموقف

وقوعہ سے تعلق	نام اور ولدیت	وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے ساتھ تعلق/رشتہ داری	عہدہ	موقف
واقعہ سے متاثر				
واقعہ کا ذمہ دار				
چشم دید گواہ				
غیر جانبدار/پڑوسی				

13-اس قسم کے واقعات علاقہ میں کس قدر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں	بہت زیادہ	اکثر اوقات	کبھی کبھار	کبھی نہیں
14-اس قسم کے واقعات اندازاً کتنی تعداد میں ہوتے ہیں	روزانہ	ماہانہ	سالانہ	

15-وقوعہ کے بارے میں HRCP نامہ نگار/اس کے ساتھ چھان بین کرنے والے/والوں کی رائے

رپورٹ بھیجنے والے کے کوائف:	نام	پتہ: گاؤں/محلّہ	شہر/ضلع

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی کس شق کی خلاف ورزی ہوئی؟

دستخط: ....

تاریخ: ....

نوٹ: اگر تفصیلات فارم پر نہ آسکیں تو نمبر لکھ کر سادے کاغذ پر تفصیل درج کریں

☆ تمام ساتھی جو انسانی حقوق کے حوالے سے رپورٹیں بھیجتے ہیں آئندہ اس فارم کی فوٹو کاپی پر کوائف پُر کر کے بھیج سکتے ہیں

Human Rights Commission of Pakistan
جہد حق
Monthly JEHD-E-HAQ

3مارچ2019،لاہور: سول سوسائٹی کی تنظیموں نے لبرٹی چوک میں حالیہ پاک۔انڈیا کشیدگی کے خاتمے کے لیے پُرامن مظاہرہ کیا اور شمعیں روشن کیں

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
''ایوان جمہور'' 107۔ ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدیدپریس، 14ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15